اردو
میں
صوفیانہ
شاعری
ڈاکٹر محمد طیبؒ ابدالی

اردو
میں
صوفیانہ شاعری
ڈاکٹر محمد طیب ابدالی
شعبہ اردو و فارسی
مگدھ یونیورسٹی - بودھ گیا - گیا

HaSnain Sialvi

اشاعت ــــــــ مئی ۱۹۸۴ء

تعداد ــــــــ ایک ہزار (۱۰۰۰)

کتابت ــــــــ

قیمت ــــــــ

طباعت ــــــــ اسرار کریمی پریس ۔ الٰہ آباد

ملنے کے پتے

ڈاکٹر محمد طیب ابدالی ــ شعبہ اردو و فارسی

مگدھ یونیورسٹی ۔ بودھ گیا ۔ گیا

مکتبہ صوفیا ــــــ خانقاہ اسلام پور ۔ اسلام پور ۔ ضلع نالندہ

خانقاہ رشیدیہ ــــ محلہ میر مست ۔ جونپور (یوپی)

بک امپوریم ــــــ سبزی باغ ۔ پٹنہ ۴

اسٹار بک ڈپو ــــــ ۴۰ ۔ اچاریہ جگدیش بوس روڈ ، کلکتہ ۱۷

نذرِ عقیدت

اس خدمت کو خلوص و عقیدت کے ساتھ

حضرت ابو المحاسن سید شاہ مصطفٰے علی سبز پوش مدظلہ

سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ ۔ جونپور (یوپی)

کے نام

انتساب کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں

جنکی نظرِ شفقت اور دلی دعاؤں نے مجھے اس قابل بنایا

خاکپائے درویشاں

محمد طیب ابدالی غفرلہٗ

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ	نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	عرضِ حقیقت	۷	۱۹	حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی	۹۸
۲	تصوف کی حقیقت	۱۵	۲۰	حضرت شاہ تراب علی قلندر کاکوروی	۱۰۳
۳	تعریفاتِ تصوف	۱۷	۲۱	حضرت شاہ ابوالحسن فرد پھلواروی	۱۰۶
۴	لفظ صوفی کی حقیقت	۲۴	۲۲	حضرت شاہ امیر الدین وحید بہاری	۱۰۸
۵	طبقاتِ اہلِ تصوف	۲۵	۲۳	حضرت شاہ عطا حسین فانی گیاوی	۱۱۱
۶	صوفیوں کی خدمات	۲۸	۲۴	حضرت شاہ امین احمد شوق بہاری	۱۱۳
۷	صوفیائے کرام اور ان کے سلاسل	۳۰	۲۵	حضرت شاہ عبد العلیم آسی غازیپوری	۱۱۶
۸	اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کی خدمات	۵۱	۲۶	حضرت شاہ فرزند علی صوفی منیری	۱۲۹
			۲۷	حضرت شاہ محمد اکبر داناپوری	۱۳۵
۹	اردو میں تمثیل نگاری	۵۸	۲۸	حضرت حضور شاہ مرشد علی القادری عاصی	۱۳۸
۱۰	اردو میں صوفیانہ شاعری	۵۹	۲۹	حضرت شاہ احمد رضا خاں بریلوی	۱۴۲
۱۱	اردو غزل اور تصوف	۶۶	۳۰	حضرت شاہ ولی مرشد القادری مرشد	۱۴۵
۱۲	حضرت شاہ کمال علی کمال دیوروی	۷۰	۳۱	حضرت شاہ سید علی کامل اسلام پوری	۱۴۷
۱۳	حضرت مرزا مظہر جانجاناں دہلوی	۷۴	۳۲	حضرت شاہ محمد محسن داناپوری	۱۵۱
۱۴	حضرت شاہ غلام نقشبند سجاد پھلواروی	۸۰	۳۳	حضرت شاہ شاہد علی سبزپوش فانی گورکھپوری	۱۵۳
۱۵	حضرت شاہ رکن الدین عشق ابوالعلائی	۸۳			
۱۶	حضرت خواجہ میر درد دہلوی	۸۸	۳۴	ولی دکنی	۱۵۶
۱۷	حضرت شاہ آیت اللہ جوہری	۹۳	۳۵	سراج اورنگ آبادی	۱۶۰
۱۸	حضرت شاہ نور الحق طپاں پھلواروی	۹۵	۳۶	مرزا محمد علی فدوی	۱۶۲

نمبر	عنوان	صفحہ
۳۷	کمال الدین حسین چشتی	۱۶۴
۳۸	شیخ غلام یحییٰ حضور	۱۶۶
۳۹	سید علی غمگین دہلوی	۱۶۸
۴۰	بے نظیر شاہ وارثی	۱۷۱
۴۱	بیدم شاہ وارثی	۱۷۴
۴۲	میر تقی میر	۱۷۷
۴۳	خواجہ حیدر علی آتش	۱۸۱
۴۴	مرزا اسد اللہ خاں غالب	۱۸۳
۴۵	علامہ محمد اقبال	۱۸۶
۴۶	فانی بدایونی	۱۸۹
۴۷	اصغر گونڈوی	۱۹۲
۴۸	کتابیات	۱۹۷

آج سے بیس برس قبل جب میں اپنے پردادا "حضرت صوفی منیریؒ کے نثری کارنامے" پر تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی کی تکمیل کی فکر میں سرگرمِ عمل تھا تو کچھ اہم مسائل میں مشورہ کے لیے مکرمی جناب قاضی عبدالودود صاحب کی خدمت میں پہنچا تو انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں "اردو شاعری میں تصوف" پر کام کروں جو میرے ذوق اور رجحان کے موافق ہے اور اسی طرح اردو اور فارسی کے دوسرے اساتذۂ کرام نے بھی اسی رائے کی موافقت کی۔ استادِ محترم ڈاکٹر سید اختر احمد اورینوی صاحب جو میرے تحقیقی مقالہ کے نگراں تھے انہوں نے تو یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ میں پی۔ ایچ۔ڈی کے بعد اپنے ڈی۔ لٹ کا موضوع اسی کو بناؤں لیکن میرے والد و مرشد حضرت سید شاہ محمد ایوب ابدالی علیہ الرحمۃ کے وصال کے بعد ناموافق حالات نے میرے اس ذوق کی تکمیل نہ ہونے دی، حالانکہ تصوف کے موضوع پر میں نے متعدد تصانیف ترتیب دے کر زیورِ طبع سے آراستہ کیا ہے۔ مجھے ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور علمی اداروں کے سمینار میں شرکت کا بھی موقع ملا ہے۔ وہاں بھی تصوف ہی کے موضوع پر اپنے مقالے پیش کئے۔ پٹنہ ریڈیو اسٹیشن اور گورکھپور ریڈیو اسٹیشن سے بھی جو میرے نشریے نشر ہوئے وہ بھی اسی موضوع سے متعلق تھے۔ جب مجھے

کسی یونیورسٹی کے فرائض کی انجام دہی کے لئے بلایا گیا تو وہاں بھی یہی موضوع زیر بحث آتا۔ ملک کے ذی علم محقق اور ناقد اساتذہ کرام اور گرانقدر شخصیتوں سے گفتگو کا موقع ملا تو انہوں نے بھی یہی موضوع چھیڑا اور مطالبے پر مطالبے ہوئے کہ میں اس موضوع پر کوئی قابل قدر تصنیف پیش کروں، حالانکہ ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب نے "آئینۂ معرفت یعنی اردو شاعری میں تصوف" کے عنوان سے ایک کتاب ترتیب دے کر ۱۹۳۲ء میں طبع کرائی۔ پھر "مذہب و شاعری" کے عنوان سے ایک اور کتاب لکھی اور اشاعت پذیر ہوئی۔ شعر الہند حصہ دوم میں مولانا عبدالسلام ندوی صاحب نے اردو میں صوفیانہ شاعری پر قدرے روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر وحید اختر صاحب "خواجہ میر درد اور تصوف" کے عنوان سے ایک گرانقدر تصنیف منظر عام پر لائے۔ اس کے علاوہ اردو کے بعض گرانقدر مصنفین نے اردو شعراء کی صوفیانہ شاعری کا جائزہ اپنی تصنیف میں مقالہ کی شکل میں لیا ہے۔ میں نے اپنی تصنیف کی ترتیب میں ان تمام تصانیف اور مقالوں کا مطالعہ کیا اور مجھے اس کا احساس ہوا کہ جو تصوف کے کوچے سے نابلد ہیں انہوں نے حقیقت کو مسخ کیا ہے اور ایسی ایسی باتیں پیش کی ہیں جو ان کی تصوف سے ناآشنائی کی دلیل ہے۔ مثلاً ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے اردو شاعری کے پہلا باب میں تصوف کی ابتداء اور ترقی پر قلم اٹھایا ہے اور اس میں فرقہ جبریہ اور قدریہ کو تصوف کی تاریخ میں پیش کیا ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ عوارف المعارف کے مصنف حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کو شیخ بوعلی سینا کی تعلیم سے اکتساب فیض ظاہر کیا ہے جو انکی لاعلمی کا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا باب شریعت، معرفت اور طریقت جیسے اہم موضوع پر ہے اس میں بھی غلط توضیح کی ہے اور اس میں سلسلہ اور صوفیوں کے فرقے پر بھی بحث کی ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ مشہور سلاسل قادریہ اور سہروردیہ کی تعلیمات اور ان کے طریقہ کار کو گمراہ کن انداز میں پیش کیا ہے۔ پانچواں باب میں اعجاز حسین صاحب نے صوفی شعراء میں صرف درد، میر، آتش، غالب، آسی غازیپوری، مرزا ہادی عزیز، اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کو جگہ دی ہے۔ اس میں صوفی شعراء میں صرف درد اور آسی غازیپوری ہی نظر آتے ہیں۔ مظہر جانجاناں اور نیاز بریلوی کیا صوفی شاعر

نہیں ؟ صوبہ بہار میں تو کوئی بھی صوفی شاعر نہیں ہے حالانکہ صوبہ بہار ہی میں اردو زبان اور
اردو شاعری کی ابتدا خانقاہوں میں اور ان بوریہ نشینوں کے ہاتھوں ہوئی ۔ غرضکہ تصنیف
مضحکہ خیز ہے ۔ مذہب و شاعری کو اچھے انداز میں لکھا گیا ہے ۔ مولانا عبدالسلام ندوی صاحب
نے صوفیانہ شاعری کو صرف توکل و قناعت اور فنا اور بقا اور مصطلحاتِ متصوفین کی شاعری
تک محدود کیا ہے اور اس کی مثالوں ہی پر اکتفا کیا ہے ۔ البتہ ڈاکٹر وحید اختر صاحب نے
اپنی تصنیف خواجہ میر درد، تصوف اور شاعری پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ نہ صرف تصوف کے کوچہ کے آشنائی نگرانی اور رہنمائی شامل ہے بلکہ اس کی تصنیف
میں وہ خود بھی اس کوچے کے شناسا بن گئے ہیں ۔ متعدد مقالوں میں صوفیانہ شاعری پر
اچھی روشنی ملتی ہے ۔ ان تمام تصانیف کے مطالعہ کے بعد مجھے اس کا احساس ہوا کہ مجھے
ان تمام حقائق پر مختصر انداز میں روشنی ڈالنی ہے جس میں روایتیں مسخ کی گئی ہیں اور یہ بھی
احساس ہوا کہ تمام اساتذہ کرام نے مجھے شاید اسی خیال سے اصرار کیا کہ میں کوشش کرکے
اس کو صحیح اور حقیقی شکل میں پیش کروں ۔ میرے دل میں بار بار یہ احساس ہوا کہ میرے
اساتذہ کرام ، محسنین اور کرم فرماؤں نے اپنی خواہش اور تمنا کا اظہار مجھ سے کیا ہے
اور اب وہ اس دنیا میں نہیں اس لئے یہ مجھ پر ایک قرض ہے جس کو ادا کرنا میرا فرض ہے
چنانچہ اسی جذبہ نے مجھے اس کام پر مجبور کیا اور میں اپنی ڈی ۔ لٹ کی تھیسس کے ساتھ ہی ساتھ
اس میں مشغول ہو گیا ۔ زیرِ نظر تصنیف اسی حقیقت کی ترجمان ہے ۔

" حقیقت میں تصوف جسے طریقت و معرفت بھی کہا جاتا ہے ایک ایسی صداقت اور
حقیقت ہے جو کسی حال اور کسی عہد میں اس سے عہدہ برآ نہیں ہوا جا سکتا خواہ وہ عملی اور وجدانی
صورت میں ہو یا علمی اور فنی شکل میں ۔ اس لئے کہ وہ ہر زمانے میں کسی نہ کسی شکل میں کبھی سامنے
آکر اور کبھی پوشیدہ رہ کر ضرور اثر انداز اور سرگرم عمل رہا ۔ خاص کر ایسے موقع پر وہ سکون کا
سامان اور درد کا درماں بن کر سامنے آیا جب جب دنیا بدامنی ، انتشار اور تباہی و بربادی
کا شکار ہوتی رہی ، انسانیت سسکتی رہی ، زندگی پناہ ڈھونڈھتی رہی ، تدبیر سر
پیٹتی رہی ، انصاف کا خون ہوتا رہا ، الاماں الاماں کی آواز فضا میں گونجتی رہی ، قتل و غارتگری کا

خونیں اور کربناک منظر چاروں طرف چھایا رہا۔ ایسی حالت میں انسان کو پناہ، سکون اور تقویت مذہب و تصوف ہی میں ملی اور وہی ان کو سکون بھی بخشتا رہا اور جہادِ زندگانی کی تعلیم بھی دیتا رہا۔

تصوف نے زبان و ادب کو بھی نکھارا اور سنوارا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اردو زبان و ادب کی ابتدائی نشو و نما صوفیائے کرام ہی کی مرہونِ منت ہے۔ اردو شاعری میں صوفیانہ خیالات ہی نے وہ تقدس اور لطافت بخشی جو آج شرفِ قبولیت حاصل کر رہی ہے۔ صوفی شعرا نے اسے گلے لگایا۔ وجدانی اور عملی طور پر صوفیانہ خیالات کو شعری جامہ پہنایا لیکن جو شعرا صوفی نہ تھے انہوں نے بھی رسمی انداز میں صوفیانہ خیالات کو اپنے اشعار میں پیش کرنا رسمِ زمانہ کے مطابق ضروری سمجھا اس لئے کہ یہی وقت کی پکار اور طمانیتِ قلب کے تقاضے تھے۔

زیرِ مطالعہ تصنیف "اردو میں صوفیانہ شاعری" میں مختلف موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تصوف کی حقیقت پر میں نے قرآن مجید کی روشنی میں بحث کی ہے۔ البتہ تعریفاتِ تصوف "تو ایک ذوقی اور وجدانی شے ہے اس لئے اس کی کوئی جامع تعریف ممکن نہیں۔ اس میں کشف المحجوب اور عوارف المعارف کے علاوہ حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کے خیالات کو بھی پیش کیا ہے جو انہوں نے مکتوباتِ صدی میں تحریر کئے ہیں۔ لفظ صوفی کی اصطلاح پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ طبقاتِ اہلِ تصوف پر بھی بحث حضرت شیخ علی ہجویریؒ کے اقوال کی روشنی میں کی ہے لیکن اس میں ان حقائق کی بھی وضاحت کی ہے جس کی وجہ سے کچھ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ "صوفیوں کی ندمات" کو مختصر انداز میں پیش کیا ہے۔

صوفیائے کرام اور ان کے سلاسل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ سلسلہ کسے کہتے ہیں اور اس کی کیا تعلیمات ہیں اس سے بہت کم خانوادے واقف ہیں۔ اسے کوئی خاندان، کوئی گھرانہ، کوئی طبقہ اور کوئی خانوادہ سے یاد کرتا ہے۔ میں نے مدھیہ پردیش کی خانقاہوں میں سجادہ نشین اور پیرانِ طریقت کی زبانوں سے یہ

الفاظ سے ہیں ہندوستان کی قدیم ہی خانقاہوں میں مختلف سلاسل نظر آتے ہیں ورنہ صرف چار سے ہے کہ یہ مشہور سلاسل ہی کا فیضان ہے۔ اگر ان سے سلسلہ پر کوئی گفتگو کی جائے تو اپنی لاعلمی کا صرف اظہار ہی نہیں کرتے بلکہ وہ تیقن کے ساتھ کہتے ہیں کہ سلسلۂ قادریہ، سلسلۂ سہروردیہ، سلسلۂ چشتیہ اور سلسلۂ نقشبندیہ کے علاوہ کوئی سلسلہ ہی نہیں ہے۔ خود تذکرہ نگار مشائخ بھی اس سلسلے میں غلط فہمی کے شکار ہوئے ہیں۔ میں نے اپنی تصنیف جادۂ عرفان حصہ اول میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے اسی میں سے کچھ اختصار کے ساتھ میں نے تصنیف ہذا میں شامل کر لیا ہے۔

اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کی خدمات" کی ضمن میں مجھے اتنا عرض کرنا ہے کہ میں نے ان اسباب کو تلاش کیا ہے جس کی وجہ سے اردو کی ابتدا ہوئی ہے۔ شمالی ہند میں بالخصوص صوبہ بہار کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہاں کے صوفیائے کرام نے اس پر زیادہ محنت کی ہے اور ان کے ترجمتی فقرے اور دوہے عہد قدیم میں اتنے دستیاب ہوتے ہیں کہ اس کے مقابلے میں دوسرا نگہ نہیں۔ میں نے اس حقیقت کا بھی انکشاف کیا ہے۔

تمثیل نگاری جسے رمز و ایما بھی کہتے ہیں تصوف کے ذریعہ اردو ادب میں داخل ہوئی اس کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ "اردو میں صوفیانہ شاعری کا تجزیہ" تفصیل سے کیا گیا ہے اس لئے کہ کتاب کا موضوع یہی ہے۔ شمالی ہند، گجرات اور دکن کے قدیم اردو کے شعرا اور ان کے کارناموں کا تذکرہ ہے اور مثنویوں میں صوفیانہ خیالات جو پیش کئے گئے ہیں اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

"اردو غزل اور تصوف" ایک اہم موضوع ہے اور یہ میری تصنیف کا ماحصل ہے۔ اس لئے کہ صوفیانہ شاعری کو جو امتیاز اور فوقیت حاصل ہے اس میں غزل ہی کارفرمائی ہے اور یہ فارسی کے صوفی شعرا کی دین ہے۔ فارسی شاعری نے براہ راست اردو شاعری کو متاثر کیا ہے۔ میں نے ان اثرات کا مختصر جائزہ لیا ہے لیکن میں نے اردو کے شعرائے متصوفین کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک تو وہ طبقہ ہے جو مسند سجادگی پر جلوہ افروز ہو کر

پیر طریقت اور مرشد طریقت کی حیثیت سے رشد و ہدایت کے فرائض انجام دیتے اور اپنے واردات قلبی ہو یا کوائفِ داخلی، جذب و مستی ہو یا عشق حقیقی سبھوں کو شعری پیکر عطا فرمایا۔ یہ ان کے ذوق و وجدان اور عمل و تجربہ کی علامت ہے۔ میں نے ان کو صوفی شعراء کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور انہیں شعراء کی پہلی صف میں جگہ دیا ہے جس کے وہ مستحق ہیں اور اس کا بھی خیال رکھا ہے کہ ان کے منصب اور عظمت میں فرق نہ آئے۔ صوفی شعراء کی یہ فہرست میں نے تاریخِ ولادت کے اعتبار سے ترتیب دی ہے صوفی شعراء کے حالات اور کلام کے سلسلے میں خانقاہوں کی خاک چھانی پڑی اور اس کے لئے دامن بھی پھیلانا پڑا۔ میں نے اس سلسلے میں قابلِ قدر اضافے کئے ہیں اور بہت سے گمنامی پسند اور قابلِ عظمت شعراء کے کلام حاصل کر کے اس میں شامل کئے ہیں، مثلاً شاہ کمالؔ دیوروئی، فانیؔ گیاوی، مشوقؔ بہاری، آسیؔ غازیپوری، عاصیؔ قادری، مرشدؔ قادری، کاملؔ اسلام پوری، محسنؔ داناپوری، اور رفائیؔ گورکھپوری قابلِ ذکر ہیں۔

کچھ صوفی شعراء ایسے بھی ہیں جو پیر طریقت تو نہیں ہیں لیکن مرید ہونے کے بعد ان میں کیف و سرور اور جذب و مستی کی ایسی حالتیں پیدا ہو گئی ہیں کہ ان کی شاعری صوفیاً حقائق و معارف کا خزینہ ہے۔ میں نے ان کو صوفی شاعر کی حیثیت سے پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔ ان میں ولیؔ دکنی، سراجؔ اورنگ آبادی کے علاوہ مرزا فدوی، حضور عظیم آبادی، غمگین دہلوی، کمالؔ چشتی، بے نظیر شاہ وارثی اور بیدم شاہ وارثی قابلِ عظمت ہیں۔

شعرائے متصوفین میں کچھ ایسی شخصیتیں بھی ہیں جو اپنی صوفیانہ شاعری کی عظمت کی وجہ سے اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں اگرچہ وہ تصوف کے کوچے سے ناآشنا ہیں اور عملی اور تجرباتی کیف و کم سے دور لیکن وہ صوفیانہ علم و فن کی آگہی کے سبب بہت سے صوفی شعراء سے ممتاز ہیں مگر میں نے انہیں شعرائے تصوف کی صف میں کھڑا کیا ہے۔ ان میں میرؔ، آتشؔ، غالبؔ ہیں اور اقبالؔ، فانیؔ بدایونی اور آصفؔ گونڈوی کو شعرائے متصوفین کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

میں نے اس تصنیف کی ترتیب میں اپنے ذاتی کتبخانہ، کتبخانہ مشرقیہ خدا بخش خاں پٹنہ، کتبخانہ حضرت سید شاہ شاہد علی سبز پوش ثانی گورکھپوری، نیشنل لائبریری کلکتہ، کتبخانہ خانقاہ منعمیہ رام ساگر۔ گیا اور ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب کے ذاتی کتبخانہ سے اکتساب فیض کیا ہے، اور اپنے خاندانی نوادرات سے بھی فیضیاب ہوا۔

میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اردو میں صوفیانہ شاعری کے تمام مباحث اور مسائل اور جو اس کے ما لہٗ و ما علیہ ہیں ان پر بسیط روشنی ڈالی ہے لیکن اس میں قابل قدر اضافہ ضرور کیا ہے اور دعوتِ فکر و نظر دی ہے تاکہ اس میں مزید اضافہ کیا جا سکے۔

حضرت سید شاہ مصطفےٰ علی سبز پوش ثانی گورکھپوری کے نام سے اس تصنیف کا انتساب کرنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ حضرت موصوف ہندوستان کی مشہور علمی و ادبی خانقاہ رشیدیہ کے سجادہ نشین تھے، مکہ معظمہ مدرسہ صولتیہ میں تعلیم حاصل کی اور اپنے والد حضرت سید شاہ شاہد علی سبز پوش ثانی گورکھپوری کے وصال کے بعد مسند سجادگی پر فائز ہو کر رشد و ہدایت کے فرائض انجام دے رہے تھے، وہ اپنے آبائی مکان دار فانی گورکھپور میں ایک روز حضرت زکریا علیہ السلام کے واقعات پڑھوا کر سن رہے تھے کہ ایک پاگل مرید اسی وقت آیا اور ان کے سر پر کلہاڑی ماری جو دماغ تک پیوست ہو گئی اور وہ صرف اتنا کہہ سکے کہ اس کو معاف کر دینا اور جام شہادت نوش کیا۔ تسلیم و رضا کی یہ مثال اولیائے عظام ہی کی سنت ہے۔ حضرت کی مجھ پر نہایت نظر کرم تھی۔

میں عم محترم جناب سید شاہ ہاشم علی سبز پوش مدظلہٗ کا ممنونِ کرم ہوں کہ آپ نے مجھے گرانقدر مشورے سے نوازا ہے۔ اور میری حوصلہ افزائی کی ہے۔

مکرمی جناب ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب صدر شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی کا ممنون منت ہوں کہ آپ نے اس تصنیف کے سلسلے میں نہ صرف ہمت افزائی کی بلکہ مفید مشورے بھی دیئے۔ ڈاکٹر سید منال شاہ القادری اور جناب سید شاہ ظلال مرشد القادری خانقاہ مجیبیہ قادریہ کلکتہ کا بھی ممنونِ کرم ہوں کہ انہوں نے اپنے خاندان کے دو صوفی شعراء کے

حالات اور کلام قلمبند کر کے مجھے ارسال کئے ہیں۔ مکرمی ڈاکٹر سید محمد حسنین صاحب، پروفیسر و صدر شعبہ اردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا اور محترمی ڈاکٹر ممتاز احمد صاحب، پروفیسر صدر شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ کا شکر گذار ہوں کہ دونوں نے اپنے گرانقدر مشوروں سے مجھے نوازا ہے اور میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ اپنے رفیق کار ڈاکٹر اصغر ظفر صاحب ایڈر شعبہ اردو مگدھ یونیورسٹی کا بھی ممنون کرم ہوں کہ انھوں نے مجھے مفید مشورے دیئے اور اس تصنیف میں خاص دلچسپی لی ہے

میں اپنے کرمفرما عزیزی ڈاکٹر خالد صدیقی صاحب ام۔ آر۔ سی۔ پی۔ ماہر امراض قلب کلکتہ، برادر گرامی قدر جناب جمال نصرت سندیلوی، اگزیکیٹو انجینیر اور ان کی اہلیہ عزیزہ فوزیہ جمال طلعا (جو کہ حضرت مصطفےٰ علی سبز پوش کی صاحبزادی ہیں) کا بھی بے حد ممنون کرم ہوں کہ آپ لوگوں نے نہ صرف ہر ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی کی ہے بلکہ اپنے گرانقدر مشوروں سے بھی نوازا ہے میں اپنے ان تمام عزیز شاگردان کے خلوص اور سعادت مندی کو بھی فراموش نہیں کر سکتا جنھوں نے اس تصنیف کی ترتیب اور نقل نویسی میں میری معاونت کی ہے۔ محبی محمد ایوب کلٹوی کا بھی ممنون ہوں کہ آپ نے اس تصنیف کی کتابت کے لئے بڑی زحمت اٹھائی۔

آخر میں میں اپنے تمام رفقا اور اعزہ کا شکر گذار ہوں جنھوں نے مجھے مفید مشوروں سے نوازا ہے، ان میں بالخصوص برادر گرامی قدر سید شمیم احمد گوہر الہ آبادی، عزیزدینی ابو محمد قادری، حاجی غلام عباس انصاری سکندر پوری، عزیزدینی سید ذکی احمد ہاشمی فردوسی، اسسٹنٹ انجنیر جبلپور اور عزیزدینی اقبال احمد قادری، اسوشیئٹ پروفیسر، بہار کالج آف انجنیرنگ قابل ذکر ہیں۔

اس حقیقت کی وضاحت بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میں نے اس تصنیف میں صوفیانہ رباعی کے موضوع پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے، یہ اس لئے ہے کہ اس موضوع پر ایک مستقل عملی تصنیف ترتیب دے رہا ہوں۔ "اردو میں صوفیانہ شاعری" زیور طبع سے آراستہ ہو رہی ہے، اس کی خوبیاں اور خامیاں قارئین کے سامنے ہیں۔ میں تمام اہل علم اور اہل ذوق سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ میری خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کریں گے۔

خاکپائے درویشاں

محمد طیب ابدالی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

تصوف کی حقیقت

یہ حقیقت ہے کہ اسلامی تہذیب میں صوفیت کی ابتدا خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے ہوئی۔ قرآن مجید میں اس حقیقت کی نشاندہی اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے :-

رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ ؕ[1]

اے میرے رب! ان ہی میں سے ایک رسول ان میں بھیج جو تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور کتاب وحکمت کی باتیں سکھائے اور ان کا تزکیہ کرے۔

گویا تین منزلیں ہیں (۱) تزکیۂ روح ونفس (۲) تعلیم کتاب (۳) اور حکمتِ کتاب کی بصیرت۔ اس کے بغیر ذہنی بلندی کے لطائفِ شریعت تک رسائی نہیں ہو سکتی اور دراصل لطائفِ شریعت ہی صوفیت ہے۔ دوسری جگہ آیا ہے :-

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ[2]

اور ایمان والوں کو اللہ کے برابر کسی کی محبت نہیں۔

ایک جگہ اور فرمایا ہے کہ :-

قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ[3]

(اے رسول آپ فرما دیجیے کہ لوگو اگر تم لوگ اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم کو چاہنے لگے گا۔

---

[1] پ ۱، ع ۱۵ سورہ بقرہ [2] پ ۲، ع ۴ سورہ بقرہ [3] پ ۳، ع ۱۲ سورہ آل عمران۔

اسی طرح حبِ الٰہی کا نظریہ اسلامی تصوف میں آیا۔ اسلامی تصوف کے حامل کی حیثیت قرآن مجید میں موجود ہے۔ قرآن حکیم نے اعلےٰ درجے کے مومن کی خصوصیات مختلف سورتوں میں بیان کی ہیں۔ کہیں اس مردِ کامل کو "عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" فرمایا اور کہیں "مومن" کہیں اسے "متقی" کہا اور کہیں "مسلم" کہیں "مقربین" کہیں "زہاد"۔ کئی مختلف پیرائے میں انسان کی ایک مثالی سیرت پیش کی گئی ہے۔ خود قرآن حکیم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ :-

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ
یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا وَّ اِذَا
خَاطَبَھُمُ الْجَاھِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا
وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّھِمْ سُجَّدًا
وَّقِیَامًا۔ وَالَّذِیْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ
یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ
ذَالِکَ قَوَامًا وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ
مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ
النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ
وَلَا یَزْنُوْنَ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذَالِکَ
یَلْقَ اَثَامًا وَالَّذِیْنَ لَا یَشْھَدُوْنَ
الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا۔
وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیَاتِ رَبِّھِمْ
لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا وَ
الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا ھَبْ لَنَا مِنْ
اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ اَعْیُنٍ وَّ
اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا۔ [۱]

اور رحمٰن کے سچے بندے وہ ہوتے ہیں جو زمین پر آرام سے چلتے ہیں (تکبر سے نہیں چلتے) ان میں سلامت روی پائی جاتی ہے اور جاہل جب ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو ان کے لئے بھی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔ وہ اپنے رب کے لئے راتیں سجدوں میں کھڑے ہو کر گزارتے ہیں۔ اور دوسری جگہ فرماتا ہے کہ" اور وہ اللہ کے بندے ایسے ہوتے ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی سے کام نہیں لیتے اور نہ بخل کرتے ہیں اور ان کا خرچ ان دونوں حالتوں میں درمیانی ہوتا ہے اور وہ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کسی اور کو معبود نہیں پکارتے اور نہ کسی جان کو جسے اللہ تعالےٰ نے حفاظت بخشی ہو وہ قتل کرتے ہیں سوائے شرعی حق کے اور نہ زنا کرتے ہیں۔ وہ جھوٹی گواہیاں نہیں دیتے اور جب لغو باتوں کے پاس سے گزرتے ہیں تو بزرگانہ طور پر اور جب انہیں ان کے رب کی آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو ان سے بہرے اور اندھوں کا معاملہ نہیں کرتے وہ یہ دعا کرتے ہیں نہ

---

[۱] سورۃ فرقان، ع ۶۔ پ ۱۹۔

ہیں کہ اے ہمارے رب ہماری بیویوں کی طرف اور اولاد کی طرف سے آنکھوں
میں ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔

یہی وہ سورتیں ہیں جن سے تصوف کی ابتدا ہوتی ہے۔ اسلام میں ابتدا ہی سے تصوف عملی صورت میں موجود تھا لیکن دوسرے علوم مثلاً علم حدیث، علم فقہ اور علم تفسیر کی طرح اس نے بھی علمی صورت زمانہ مابعد میں حاصل کی اور سب کا منبع قرآن مجید اور حدیث شریف ہے اور سب کا عملی وجود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے عہد مبارک میں پایا جاتا ہے۔

حضور مقبول صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کی زندگیاں بالکل مومنانہ اور صوفیانہ رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ اصحاب صفہ کے علاوہ بھی جتنے اصحاب تھے سب صدق وصفا، تسلیم ورضا اور اخلاق ووفا میں آگے بڑھے ہوئے تھے۔ بوترابی کیفیت صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ میں ہی ظاہر نہیں ہوئی بلکہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذوالنورین، حضرت سلمان فارسی اور حضرت عمار پر بھی طاری ہوئی۔ صحابی کے بعد تابعی کا دور آتا ہے اس دور میں کچھ ایسے تابعین بھی تھے جنہوں نے اپنے اقوال وافعال سے تصوف پر گہرا اثر ڈالا ان میں حضرت حسن بصریؒ اور حضرت اویس قرنیؒ مشہور ہیں۔ آپ کے بعد تبع تابعین کا دور آتا ہے۔ اس میں حضرت عبدالواحد بن زیدؒ، حضرت مالک بن دینار، حضرت حبیب عجمیؒ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس دور میں اسلامی تصوف کو بہت فروغ حاصل ہوا لیکن ان سب باتوں کے باوجود تصوف فن اور علم کی حیثیت سے ایک منفرد مقام حاصل نہ کر سکا اور صوفی کے لقب سے کوئی مشہور نہ ہو سکا۔

تعریفات تصوف

علم تصوف کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ تصوف ایک ایسا مسلک ہے جس کی آج تک کوئی جامع تعریف نہیں ہو سکی ہے اس لئے کہ یہ ایک ذاتی، تجرباتی، ذوقی اور وجدانی شئے ہے۔ ایسی حالت میں تمام اصحاب رائے کا اتفاق ایک ہی بات پر ہونا محال ہے۔ کیونکہ ہر ایک کا ذوق ووجدان مختلف ہے۔ جس کا ذوق جتنا زیادہ لطیف ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ حقیقت الامر کو سمجھ سکتا ہے۔

اس کے علاوہ مسلکِ تصوف نے کسی زمانے میں کوئی واحد اور مستقل صورت اختیار نہیں کی ہر عہد میں اس کی شکل و صورت بدلتی رہی۔ اوائلِ اسلام میں تصوف محض زہد و تقویٰ کی صورت میں موجود تھا۔ زمانہ مابعد میں اس میں برابر مختلف رنگوں کی آمیزش ہوتی رہی اس لئے اس کی کوئی جامع تعریف ممکن نہیں تاہم صوفیائے کرام نے اپنے ذوق و وجدان کے مطابق اس کی جو تعریفیں کی ہیں ان میں چند پیش کی جاتی ہیں تاکہ ان کے ذریعہ تصوف کے مفاہیم و مطالب پر روشنی پڑ سکے۔

حضرت شیخ علی بن عثمان ہجویریؒ نے اپنی تصنیف "کشف المحجوب" میں دورِ قدماء کے صوفیائے عظام کی تعلیمات تصوف جمع کی ہیں ان میں سے چند ہدیۂ قارئین ہیں:

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ نے تصوف کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

التصوف نعت اقیم العبد فیہ قیل نعت العبد ام للحق فقال نعت الحق حقیقۃ و نعت العبد رسماً [۲] (جنید بغدادی)	تصوف وہ صفت ہے جس میں بندہ کی اقامت کی گئی ہے (یعنی اس کا وجود ہے) لوگوں نے پوچھا کہ یہ صفت بندہ کی ہے یا حق کی؟ جواب دیا کہ حقیقتاً تو حق کی ہے۔ رسماً بندہ کی ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ کا ارشاد ہے:

الصوفی اذا نطق بان نطق عن الحقائق و ان سکت نطقت عنہ الجوارح بقطع العلائق (ذوالنون مصریؒ)	صوفی وہ ہے کہ جب وہ گفتار میں آتا ہے تو اس کی زبان حقائق کی ترجمان ہوتی ہے اور جب خاموش ہوتا ہے تو اس کے اعضا قطعِ علائق پر زبانِ حال سے شہادت دیتے ہیں۔

حضرت ابوالحسن نوریؒ فرماتے ہیں کہ:

التصوف ترک کل حظ للنفس (ابوالحسن نوریؒ)	تصوف تمام حظوظِ نفسانی کے ترک کا نام ہے۔

---

[۱] حضرت صوفی منیریؒ کے نثری کارنامے ص ۷۹۔ [۲] کشف المحجوب ص ۲۶-۱۹ بحوالہ تصوفِ اسلام۔

حضرت ابوبکر شبلیؒ کا ارشاد ہے کہ :-

الصوفی لا یری فی الدارین مع الله غیر الله (ابوبکر شبلی رح)	صوفی وہ ہے جو دونوں جہان میں اللہ کے سوا اور کسی کو نہیں دیکھتا۔

حضرت شیخ علی بن بندار نیشاپوریؒ کا قول ہے کہ :

التصوف اسقاط الرؤیة للحق ظاهراً و باطناً (علی بن بندار نیشاپوریؒ)	تصوف یہ ہے کہ بجز حق کے ظاہر و باطن میں اور کچھ نہ نظر آئے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنی تصنیف فتوح الغیب میں ارشاد فرمایا ہے کہ :-

التصوف مبنیٌ علی ثمان خصالٍ السخا لابراهیم والرضا لاسحق والصبر لایوب والاشارة لزکریا والغربة لیحیٰی ولبس الصوف لموسیٰ والسیاحة لعیسیٰ والفقر لمحمد صلی الله علیه وسلم (شیخ عبدالقادر جیلانی)	تصوف آٹھ خصلتوں پر مبنی ہے۔ سخاوت ابراہیم پر، رضائے اسحاق پر، صبر ایوب پر، مناجات زکریا پر، غربت یحییٰ پر، خرقہ پوشی موسیٰ پر، تجرد عیسیٰ پر اور فقر محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر۔

شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ اپنی تصنیف عوارف المعارف میں تحریر فرماتے ہیں :

فاستوفوا جمیع اقسام المتابعة وحیاسنة اقصی الحاجاتِ[1] (شیخ الشیوخ)	صوفیا نام ہے اس گروہ کا جس نے ہر قسم کی پیروی رسول کا حق ادا کر دیا اور سنتِ رسول کو انتہائی درجہ تک زندہ کر دیا۔

شیخ الشیوخ نے شیخ عبدالواحد بن زید کی[2] تعریف اپنی تصنیف میں تحریر کیا ہے :-

قال القائمون بعقولهم علی نهم السنّة والعاکفون علیها	جو لوگ سنت رسول پر اپنی عقل کو صرف کرتے ہیں اور اپنے قلب سے متوجہ رہتے ہیں اور اپنے

---

[1] عوارف المعارف ص۲۷ مصنفہ شیخ الشیوخ۔

ویلوذ بهم المعتصمون بسیدهم من شر نفوسهم وهم الصوفیة

نفس کی خباثت سے اپنے سرور دوسرا کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، وہی صوفیا ہیں۔

(عبد الواحد بن زید)

شیخ الشیوخ اس تعریف کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

هذا وصفٌ تامٌّ وصفهم به

یہ ان کی بہترین تعریف ہے جو کی گئی ہے۔

حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ نے شریعت و طریقت کی لطافت اور وضاحت بڑے دلکش پیرائے میں کی ہے۔ وہ اپنے مکتوب بست و پنجم میں تحریر کرتے ہیں کہ:

طریقت راہے است کہ از شریعت خیزد و شریعت بیان توحید و طہارت و نماز و روزہ و حج و جہاد و زکوٰۃ و دیگر احکام شرع و معاملات است۔ اما طریقت طلب کردن بحقیقت این معاملات است و تفحص کردن این مشروعات و آراستن اعمال بصفای ضمائر و تطہیر اخلاق است از کدورات طبع چون ریا و ہوا و جفا و شرک مانند این در جملہ ہرچہ بہ تہذیب و تطہیر ظاہر تعلق دارد شریعت است و ہرچہ بہ تصفیہ و تزکیہ باطن تعلق دارد طریقت است۔ مثلاً جائے نماز را طاہر کردن از لوث نجاست شریعت است و دل پاک کردن از کدورات بشریت طریقت است۔ پیش از نماز وضو کردن شریعت است و ہمیشہ با وضو بودن طریقت است، در نماز روئے قبلہ آوردن شریعت است در روئے دل بحق

طریقت وہ راہ ہے جو شریعت سے نکلتی ہے اور شریعت کا تعلق توحید، طہارت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد اور دیگر شرعی احکام اور معاملات سے ہے۔ لیکن طریقت ان معاملات کی حقیقت دریافت کرنے، ان مشروعات میں تفحص کرنے، اعمال کو صفائی ضمیر کے ساتھ آراستہ کرنے اور طبعی کدورتوں سے اخلاق کو پاک کرنے سے متعلق ہے۔ جب ریا، ہوا، جفا، شرک اور ان کی مانند دوسرے جملہ صفات کی تہذیب و تطہیر کا تعلق ظاہر سے ہو تو یہ شریعت ہے اور جو کچھ کہ باطن کے تصفیہ و تزکیہ سے تعلق رکھے، طریقت ہے مثلاً نماز پڑھنے کی جگہ کو نجاست کی آلودگی سے پاک کرنا شریعت ہے اور بشری کدورتوں سے دل کو پاک کرنا طریقت ہے، نماز کے پہلے وضو کرنا شریعت ہے اور ہمیشہ باوضو رہنا طریقت ہے۔ نماز میں قبلہ رو ہونا شریعت ہے اور اس میں دل کو حق کی

آوردن طریقت است، و در جملہ ہر چہ در مرتبۂ حواس فرود آید رعایت آں کردن از شریعت است و ہر چہ درون پردۂ قالب است رعایت کردن آں طریقت است و ہر چہ انبیاء علیہم السلام امتِ خود را آں فرمانند کہ خود کنند“ ؎۱

طرف متوجہ رکھنا طریقت ہے۔ جو اس کے اعضا سے جو کچھ پیش آئے ان سبھوں کی رعایت کرنا شریعت ہے اور جو کچھ پردۂ قالب کے اندر ہے اس کی رعایت کرنا طریقت ہے اور ہر چند کہ انبیاء علیہم السلام اس کا حکم فرماتے ہیں جو خود کرتے ہیں۔

تصوف بھی طریقت کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ اپنے ایک مکتوب میں اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:۔

بدانکہ راہِ تصوف دیرینہ است و اعمالِ انبیاء و صدیقاں بودہ است بحکم غلبۂ عاداتِ زشت در زمانہ پدید آمدہ است صورتِ حالِ صوفیاں در چشم مرداں زشت می نماید ؎۲

”معلوم ہو کہ راہِ تصوف قدیم ہے اور انبیاء اور صدیقین کے اعمال بھی یہی ہیں چوں کہ (اب) برائی کا غلبہ ہے اس لئے صوفیوں کا حال بھی لوگوں کی نگاہ میں برا دکھائی دیتا ہے“ حالانکہ یہ راہ محبت کی راہ ہے۔

حضرت مخدوم مکتوب چہل و ششم میں اس طرح فرماتے ہیں کہ:۔

بداں کہ مخلوقات دیگر را با محبت کار بود کہ ہمت بلند نہ داشتند آں کار ملائکہ کہ راست بینی از آنست کہ ایشاں حدیثِ محبت نہ رفتہ است و ایں زیر و زبر کہ در او میاں می بینی از آنست کہ برایشاں حدیثِ محبت رفتہ کہ یُحِبُّونَهُمْ وَيُحِبُّونَهُ ؎۳

معلوم ہو کہ اور مخلوق کو محبت سے سروکار نہیں اس لئے کہ بلند ہمت نہیں رکھتے اور یہ جو فرشتوں کا کام بے خلل دیکھتے ہو اس لئے ہے کہ ان کے ساتھ معاملاتِ محبت کا سروکار نہیں اور یہ ہنگامہ اور تہہ و بالا کہ آدمیوں کے درمیان دیکھتے ہو اس سبب سے ہے کہ ان کے ساتھ محبت کا رشتہ ہے وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ ان سے محبت کرتے ہیں۔

؎۱ مکتوباتِ صدی مصنفہ حضرت مخدوم جہاںؒ۔ مکتوب بست و پنجم در ارکانِ شریعت و طریقت بحوالہ الشرف صـ۱۰۹

؎۲ مکتوبات صدی مصنفہ حضرت مخدوم جہاں مکتوب بست و دوم ؎۳ الشرف صـ۵۔

تصوف کی ان تمام تعریفات کے باوجود متقدمین کا ایک گروہ کہتا ہے کہ عہد رسالت میں کوئی شخص بھی صوفی کے لقب سے نوازا نہیں گیا ہے۔ یہ اصطلاح بعد میں وضع کی گئی ہے۔ اس لئے اسلام میں اس کی کوئی وقعت اور حقیقت نہیں لیکن حضرت شیخ ابونصر سراجؒ (وفات ۳۷۸ھ) نے اپنی تصنیف کتاب اللمع[1] میں اس کا جواب اس طرح دیا ہے:

(ترجمہ) ـــــ "اصحابِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی دوسرا تعظیمی لفظ مستعمل ہو ہی نہیں سکتا تھا اس لئے کہ ان کے جتنے بھی فضائل تھے سب سے اشرف و اعظم ان کی فضیلت صحابیت تھی کہ صحبتِ رسول تمام بزرگیوں اور فضیلتوں سے بڑھ کر ہے ان کا زہد، فقر و توکل، عبادات، صبر و رضا غرض جو کچھ بھی ہو ان کے فضائل تھے ان سب پر ان کا شرفِ صحابیت غالب تھا پس جب کسی کو لفظ صحابی سے ملقب کر دیا گیا تو اس کے فضائل کی انتہا ہو گئی اور کوئی محل ہی باقی نہ رہا کہ اسے صوفی یا کسی دوسرے تعظیمی لفظ سے یاد کیا جائے"۔

لفظ صوفی کی اصطلاح پر مختلف لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ کشف المحجوب میں اس کی وضاحت اس طرح ہے:-

"مردماں اندر تحقیق ایں اسم بسیار سخن گفتہ اند و کتب ساختہ و گروہ از آں گفتہ اند کہ صوفی را برائے صوفی خواندہ اند کہ جامۂ صوف دارد و گروہ گفتہ اند کہ صوفی را برائے آں صوفی خوانند کہ صف اول باشد و گروہے گفتہ اند کہ بداں صوفی گویند کہ تولی بہ اصحابِ صفہ رضی اللہ عنہم کردہ اند و گروہے

اس نام کی تحقیق میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں اور بہت سے قول ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک چونکہ یہ لوگ جامۂ صوف میں ملبوس رہتے تھے اس لئے صوفی کہلائے۔ بعض کا خیال ہے کہ لفظ صوفی کا ماخذ صفِ اوّل ہے۔ ایک گروہ کا مسلک ہے کہ چوں کہ ان لوگوں کو اصحابِ صفہ سے خاص محبت تھی اس لئے یہ صوفی کہلائے۔ ایک اور جماعت

---

[1] کتاب اللمع حضرت الشیخ ابو النصر سراجؒ کی گرانقدر تصنیف عربی زبان میں ہے جو تصوف میں سب سے پہلی کتاب ہے (رجوع التصوف اسلام مصنفہ عبد الماجد دریا آبادی)

گفتہ اند کہ ایں اسم از صفا مشتق است و ہر کسے را اندریں معنی اند تحقیق ایں طریقت لطائف بسیار است مراما بہ تقضائے لغت ازیں معنی بعید می باشد ؎۱

اس لفظ کا اشتقاق لفظ صفا سے بتاتی ہے اور ہر گروہ اپنی تائید میں دلائل و شواہد لاتا ہے۔ لیکن لغت میں کسی قول کی بھی تائید نہیں ہوتی۔

حضرت محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم صوفی اعظم تھے۔ قرآن کریم میں جتنی تعلیمات ہیں آپ نے سب پر عمل کر دکھایا اور آپ خُلق عظیم کے مقام پر کھڑے ہوئے۔ آپ میں باطنی اور خارجی پاکیزگیوں کی ہر قسم پائی گئی۔ قرآن کریم مجمع البحرین ہے اور محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم مجمع البحرین ہیں۔ قرآن کریم میں روحانی اور مادی برکتوں کے سمندر موجیں مارتے ہیں اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات و صفات میں بھی۔ غرض خالص اسلامی صوفیت اسلام سے علیحدہ کوئی چیز نہیں اسلامی شریعت اپنے اندر طریقت کو بھی سموئے ہوئے ہے۔ دراصل شریعت اور طریقت کے ایک ہی معنی ہیں "راستہ" اسلام قرآن مجید کے ذریعہ بہترین راستے کی رہنمائی کرتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے شریعت اور طریقت میں کوئی ضد نہیں بعد میں لوگوں نے اختلافات پیدا کئے۔ اسلام کی تعلیم ہمہ جہتی اور کلی ہے وہ اجزاء پر زور نہیں دیتا بلکہ تکمیل پر زور دیتا ہے۔ اسلامی اصول یہ ہے کہ تزکیۂ روح بھی ضروری ہے اور تعلیم کتاب بھی لازمی ہے۔ اسلامی تعلیم کو مکمل کئے بغیر تزکیۂ روح ناممکن ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ۔ قرآن حکیم کی چھوٹی سی چھوٹی تعلیم بھی کمال اہمیت رکھتی ہے۔ شریعت قرآن کو کسی حالت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن خشک مذہبیت کا قائل نہیں۔ شریعت کی بے جان پابندی کو مکروہ قرار دیتا ہے اول تو وہ شریعت کی حکمت سکھاتا ہے۔ قرآن مجید علمائے یہود پر تعمیری طنز کرتا ہوا فرماتا ہے :-

مَثَلُ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا ؎۲

ان کی مثال ان گدھوں کی طرح ہے جو کتاب کا صحیح علم اور تفسیر نہیں رکھتے صرف کتاب ڈھوتے چلتے ہیں۔

؎۱ کشف المحجوب صد ۲۳ ۔ ؎۲ پ ۲۸ غ سورہ جمعہ ۔

لفظ صوفی کی حقیقت

اصل صوفیت عین اسلام ہے۔ صوفی وہ ہے جو مومن و مسلم ہو اور خارجی مکارم کے ساتھ باطنی حسن و اخلاق پر بھی نظر رکھے اور وہ زندگی کی اصل غرض داخلی اور روحانی اصلاح کو قرار دے۔ خشیت الٰہی سے لرزاں اور محبت الٰہی سے سرشار ہو۔ اس کی زندگی صاف، سادہ اور بے داغ ہو۔ اس میں دکھاوا بالکل نہ ہو۔ وہ سختیاں سہنے کا عادی ہو اور دنیا کے عیش و تنعم کو مقصد حیات نہ سمجھے۔ دنیا مطمحِ نظر نہ ہو۔ ایک طرف اس میں اگر خدا کا عشق ہو تو دوسری طرف خدا کے بندے کی محبت بھی پائی جائے۔ ایک سچا صوفی وہ ہے جو معیاری مسلمان ہو۔ قرونِ اولیٰ کے بعد جو مسلمانوں پر دنیاوی نعمتوں کی بارش ہوئی تو فطری میلانات کے تحت اہلِ اسلام کا ایک طبقہ دین سے غافل ہو گیا اور جو دین پر قائم بھی رہے ان میں رقتِ قلب نہ رہی یہاں تک کہ علماء کی ایک بڑی تعداد محض ظاہرداریوں اور احکاماتِ دین کی سطحی پیرویوں میں کچھ اس طرح الجھ کر رہ گئی کہ انہوں نے شریعت کے حکموں سے بچنے کے لئے "کتاب الحیل" بھی تصنیف کی۔ دین اسلام کا قشر لوگوں کے ہاتھوں میں رہ گیا اور مغز سے بے بہرہ ہو گئے تو پھر اللہ تعالےٰ نے ہر صدی کے سر پر اور صدیوں کے درمیان بھی مجددین اور اصفیاء کو پیدا کیا اور ان لوگوں نے تزکیہ قلوب، پاکیزگی روح اور مذہب کی باطنی قدروں پر زور دیا۔ عیش طلبی کو خیرباد کہا اور سادہ زندگی کی طرف خلقتِ خدا کو مائل کیا۔ حقیقی مسلم صوفیوں نے کبھی بھی ترک دنیا کا وعظ نہیں دیا کیوں کہ ان کے آقا نے فرمایا کہ :-

لا رھبانیۃ فی الاسلام — اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔

شیخ کے نزدیک صوفی وہ ہے جس کا لقب صفا (صفائی) سے لبریز اور کدر (گندگی) سے خالی ہو اور اس مرتبہ تک کاملانِ ولایت ہی پہنچ سکتے ہیں۔

"صفا ضد کدر بود و کدر ضد بشر بود، و بہ حقیقت صوفی بود آنکہ او از کدر گزر بود۔" [1]

دوسری جگہ تحریر ہے کہ :-

"صوفی نامے است کہ مر کاملانِ ولایت را محققانِ بدیں نامے خواندہ اند۔" [2]

---

[1] کشف المحجوب ص ۲۳ [2] بحوالہ تصوف اسلام ص ۲۳۔

چنانچہ دورِ اول کے مشائخ طریقت میں سے کسی بزرگ کا قول ہے کہ:۔

مَنْ صفاہ الحب فھو صافٍ
ومن صفاہ الحبیبُ فھو صوفی [۱]

جب کسی بزرگ کو محبت صاف کر دے تو وہ صاف ہے اور جسے محبوب اپنے لئے صاف کر دے وہ صوفی ہے۔

طبقاتِ اہلِ تصوف

شیخ علی ہجویریؒ نے اہلِ تصوف کے تین طبقے یا درجے بتاتے ہیں۔ صوفی۔ متصوف۔ مستصوف۔ شیخ کے الفاظ میں اس کی وضاحت سنئے:۔

"صوفی آں بود کہ از خود فانی بود وحق باقی واز قبضۂ طبائع رستہ وبحق پیوستہ متصوف بمجاہدہ ایں درجہ را ہمی طلبید واندر طلب خود را بر معاملاتِ ایشاں درست ہمی کند۔ ومستصوف آنکہ برائے مال ومنال وجاہ ودنیا خود را مانند ایشاں کردہ واز ہر دو چیز ہیچ خبرے ندارد تا حدے کہ گفتہ اند المستصوف عند الصوفیۃ کالذباب وعند غیرھم کالذباب مستصوف بہ نزدیک صوفی از حقیرے چوں مگس بود، آنچہ کند نزدیک وی ہوس بود ونزدیک دیگراں چوں گرگ بے اختیار بود کہ ہمتش لختے مردار بود [۲]"

صوفی وہ ہے جو اپنے نفس سے فانی ہو کر حق میں زندہ و باقی ہو اور مادیت سے گزر کر حقیقت تک رسائی حاصل کر چکا ہو اور متصوف وہ ہے جو مجاہدہ کر کے یہ راہ طے کر رہا ہو اور اس منزل تک رسائی کی کوشش میں ہو اور مستصوف وہ ہے جو شخص جاہ و مال کے لئے دنیا طلبی کی خاطر اپنے کو صوفیہ اور متصوفہ کے مشابہ بنا دے اور حقیقتاً ان دونوں سے بہرہ مند نہ ہو۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ مستصوف صوفی کی نظر میں مکھی کی طرح حقیر ہوتا ہے اور دوسرے کی نظر میں بھیڑیے کی مانند جس کی غذا ہی گوشت اور خون ہے۔

تصوف کے لئے محبت بھی ضروری ہے۔ حضرت مخدوم جہاںؒ [۳] فرماتے ہیں:۔

"بداں اے برادر! چوں کہ بظاہر روزہ و نماز فریضہ است و در باطن محبت و

اے برادر تم کو معلوم ہے جیسا کہ بظاہر روزہ فرض ہے باطن میں عشق و محبت فرض ہے

---

[۱] کشف المحجوب ص ۲۵ [۲] کشف المحجوب مصنفہ شیخ علی ہجویریؒ ص ۲۵

عشق فریضہ است خمیر و مایۂ آں درد و اندوہ است۔ عشق بندہ را بخدا می رساند از آں معنی عشق فرض راہ آمدہ۔ حیات از عشق می شناس و ممات بے عشق می یاب"۔ [1]	جس کی پونجی درد واندوہ ہے۔ عشق بندے کو خدا تک پہنچاتا ہے اور اس معنی میں کہ عشق فرض راہ ہے زندگی کو عشق کے ذریعہ پہچانو اور موت بے عشق کے جذبے کو جانو۔

اپنے اپنے ذوق و بصیرت کے اعتبار سے صوفیت کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ لیکن تعریفیں مسلک کے اعتبار سے بھی ہوئی ہیں۔ فی الحال ہمیں صوفیت کو مدنظر رکھنا ہے۔ مسلم تہذیب میں بھی صوفیت کے مختلف خانوادے اور سلاسل ابھرے اور ان میں اختلاف بھی ہے۔ پھر بعض عناصر مسلم صوفیت میں ایسے بھی آگئے ہیں جنہیں ہم غیر اسلامی کہیں گے۔ یہ عناصر خصوصاً یونان اور ہندستان سے آئے لہٰذا اختلافات پیدا ہوئے۔

مسلمان صوفیوں نے تبلیغ دین کا کام کیا۔ شریعت کو مستحکم بنایا اور اسلام کی لطافتوں کو پیش کیا۔ ان کے سلسلے غلط قسم کی باتوں کو ہرگز پیش نہیں کرتے تھے۔ اگر ہم ان صوفیوں کی تصانیف کا مطالعہ کریں تو صاف طور پر پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے شریعت کا اتباع کیا اور اس کی پیروی کی ہے۔ ان کی مراد طریقت سے صرف یہ تھی کہ وہ اپنے اپنے طور پر ضرورت اور حالات کے لحاظ سے تربیتِ اخلاق اور تزکیۂ روح کے مناسب نفسیاتی طریقے مقرر کرتے رہتے تھے۔ عبادت اور ریاضت اور ورد و وظائف کی تعلیم اسی غرض سے کی تھی۔ ان کا طریقہ تربیت دائرہ اسلام کے اندر رہ کر تھا۔ صوفیائے کرام اسلام کے بہت بڑے ستون تھے ان بزرگوں نے تربیت روح کے لئے مختلف منازل اور مقامات متعین کئے ہیں ان کو کبھی مقام اور کبھی عالم کہتے ہیں۔ روحِ انسانی تربیت پاکر مشاہدۂ جمالِ الٰہی کرتی ہے اور چونکہ خدا کی ذات و صفات بیکراں ہے اس لئے وہ مختلف مقامات سے گزرتی ہے۔ صوفیوں نے ان مقامات کے اصطلاحی نام رکھے ہیں جیسے "عالمِ حیرت"، "عالمِ جذب"، "عالمِ فنا"، "عالمِ بقا" وغیرہ۔ مرکب اصطلاحیں بھی پائی جاتی ہیں۔ جیسے "فنا فی الشیخ"، "فنا فی

---

[1] فوائدِ رکنی۔ فوائدِ اول ملفوظات مخدوم جہاں رحمۃ اللہ علیہ۔

الرسول"، "فنا فی اللہ" اور "باقی باللہ" وغیرہ۔ یہ ساری اصطلاحیں تمثیلی اور رمزی ہیں۔ ان میں استعارہ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ بعض دفعہ لوگوں نے صوفیوں کی تعبیرات کو اپنے اپنے ذوق کے مطابق سمجھ لیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود صوفیوں سے اس جہت میں غلطی ہوئی ہو کہ وہ عوام الناس کے ذہن کی گمراہی کے امکانات کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکے۔ بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کو اسلامی شریعت کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ورنہ بڑے بڑے خطرات پیدا ہو جائیں گے۔ خصوصاً وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مسائل، "ہمہ اوست" اور "ہمہ از وست" کا نازک فرق۔ عالم جذب و مستی میں ایک صوفی ہمہ اوست کا نعرہ لگا دیتا ہے۔ لیکن ایک سالک صوفی وحدہٗ لا شریک کا اس اعتبار سے قائل ہوتا ہے کہ کوئی چیز خدائے تعالےٰ کے مثل نہیں بن سکتی، اس کا جزو بھی قرار نہیں دی جا سکتی ہے۔ ساری کائنات اس کی مخلوق ہے اور وہ خالق۔ چونکہ ہر چیز خدا کے مقابلے میں ہیچ ہے اس لئے عالم میں خدا کی ذات ہی ہے اور کچھ نہیں اور ہر شئے پر اس کا اقتدار کامل ہے اور ہر چیز میں اس کی صفتوں کی جلوہ گری ہے، اس طرح اضافی طور سے "ہمہ اوست" کہا جا سکتا ہے۔ لیکن بعض صوفیوں نے احتیاط کی ہے اور اسلامی نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے "ہمہ از وست" کہا۔ اگر ہم وحدۃ الوجود کے متعلق یہ کہیں کہ ہر چیز خدا ہے تو گمراہ کن خیال ہے لیکن اگر اس کے معنی یہ لیں کہ اللہ تعالیٰ کا وجود وحدانی ہے تو یہ صحیح ہے دوسرے چھوٹے چھوٹے وجود خدائے تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور چونکہ خالق کے مقابلے میں ہیچ ہیں اس لئے اضافی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اصل وجود خدائے تعالیٰ ہی کا ہے اور عالم میں اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہی صوفیوں نے اس خطرے سے بچنے کے لئے محتاط طور سے یہ کہا کہ اس کائنات کے ذرے ذرے میں صرف خدائے تعالیٰ کی عظمت کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اس کی ذات جلوہ کناں ہے۔ ہر شئے میں ہم اس کی کبریائی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ میں مختلف نشیب و فراز پیدا ہوئے اور مسلمانوں کے صوفیانہ خیالات میں دوسرے ادیان کے خیالات کی ملاوٹ بھی ہوئی۔ کہیں نو افلاطونی خیالات داخل ہوئے تو کہیں ایرانی خیالات، کہیں عیسائیت نے نقصان پہنچایا

توکہیں بودھ مت نے اور سب سے بڑھ کر ہندو تہذیب کے الجھے ہوئے ویدانتی فلسفے نے۔ ان سارے بیرونی افکار و خیالات نے بعض کمزور ذہن اور ناتواں قلب رکھنے والے صوفیوں کو متاثر کیا یہاں تک کہ اسلامی صوفیت میں امراض پیدا ہو گئے۔ کہیں رہبانیت نے جنم لیا اور کہیں ملحدانہ خیالات نے سر اٹھایا اور اسلامی صوفیت اپنی پاک اور منزہ حالت پر قائم نہ رہ سکی لیکن اس کے باوجود ہر دور میں صحیح اسلامی ذہنیت رکھنے والے صوفی بھی بڑے جمال و جلال سے نمودار ہوئے اور انہوں نے غیر اسلامی بنیان افکار کو توڑا اور اللہ تعالٰے نے ان خطرناک اثرات کو دور کرنے کے لئے بکثرت ایسے صوفیوں کو مامور کیا جنہوں نے وحدانیت کا مصفّٰے و منزہ چہرہ دکھلایا۔

صوفیوں کی خدمات

یہ حقیقت ہے کہ جس انسان کے اندر یہ جذبہ ہوا اور اس پر عمل پیرا ہوا وہ صوفی ہے وہ رسم ظاہری کا قائل نہیں ہوتا۔ وہ ظاہر کو نہیں باطن کو دیکھتا ہے اس کی نظر برائیوں پر نہیں پڑتی بلکہ برائی میں بھی بھلائی کا پہلو نکال لیتا ہے۔ بروں سے نفرت نہیں کرتا انہیں گلے لگاتا ہے اور نیک اطوار بناتا ہے، وہ مہر و محبت کا سبق دیتا ہے اور نرمی و دلجوئی کی باتیں کرتا ہے، وہ اپنی خاکساری اور عاجزی سے دلوں میں گھر کرتا ہے، وہ دوسروں کے اعمال کا محاسبہ نہیں کرتا بلکہ خود اپنے عمل اور نفس کا محاسبہ کرتا ہے، وہ اپنے عمل سے دلوں کو لبھاتا ہے۔ صوفی وہ ہے جس کی زندگی صاف، سادہ اور بے داغ ہو۔ اس میں دکھلاوا بالکل نہ پایا جائے۔ وہ سختیاں سہنے کا عادی ہو اور دنیا کے عیش و آرام کو زندگی کا اصل مقصد نہ قرار دے۔ اگر ایک طرف اس میں خدا کی محبت ہو تو دوسری طرف اس میں خدا کے بندوں سے بھی الفت پائی جائے۔ اس محبت کی تعلیم اور صلح و آشتی کا پیغام دینے کے لئے وہ دور دراز ملکوں سے سمندروں کے سینے کو چیرتے ہوئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روندتے ہوئے، پُر خار جھاڑیوں اور خطرناک جنگلوں سے الجھتے اور گزرتے ہوئے، پُر خطر گھاٹیوں اور دشوار گزار راستوں کو طے کرتے ہوئے دنیا کی وسیع سرزمین پر پھیل گئے۔ کسی نے پہاڑوں کے غار میں پناہ لی تو کسی نے جنگلوں میں بسیرا ڈالا تو کوئی دریا کے کنارے زمین پر جھونپڑا بنا کر آباد ہوا۔ یہ تمام سختیاں اور تکلیفیں صوفیائے کرام نے انسانیت کا درس، خلوص و محبت کی تعلیم اور ایثار و قربانی کا سبق دینے کے لئے

برداشت کیں۔ ان کا آستانہ نہ صرف خواص کے لئے تھا بلکہ عوام کے لئے بھی جو بالآخر خانقاہ کے نام سے موسوم ہوا۔ جہاں سے سکون، اخلاص اور محبت کی تعلیم دی جاتی رہی۔ ان کی خانقاہیں مضطرب دلوں کے لئے سکون، پریشان حال کے لئے اطمینان اور بے سہاروں کے لئے سہارے کا سامان بنیں۔ جہاں چھوٹے بڑے، امیر وغریب، قوی وضعیف اور عالم وجاہل کا کوئی امتیاز اور فرق نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام نے ایک انسان کو دوسرے انسان کے قریب کر دیا۔ انہوں نے محبت وبھائی چارگی کا ایسا سبق عوام کو پڑھایا اور اپنے اخلاق ومحبت سے ایسا اثر ڈالا کہ عوام ان کی گرویدہ ہوگئی اور لوگ عقیدت کے ساتھ جوق در جوق ان کی خانقاہوں میں آنے لگے اور ان کے پیغام اور بے لوث اخلاق ان کے دلوں کو متاثر کرتے رہے تو صوفیائے کرام اپنی محبت واخلاص اور ایثار وقربانی سے عوام کے دلوں کو فتح کرتے رہے ان کی حکمرانی بلا تخصیص مذہب وملت اور خواص وعوام کے دلوں پر تھی۔ غم زدہ اور ٹوٹے ہوئے دلوں پر مرہم رکھنا ان کا فرض اور بے سہاروں کو سہارا دینا ان کا شیوہ تھا یہی وجہ ہے کہ ان کا سب سے گہرا تعلق عوام سے تھا۔

صوفیائے کرام اور ان کے سلاسل

یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ صوفیائے کرام ہی کی وہ مقدس اور متبرک ذاتِ گرامی ہے جنہوں نے
تبلیغِ اسلام کے ساتھ ساتھ انسانیت کی چارہ سازی اور عوام کی غم گساری کے لیے اپنی ذات کو
وقف کر دیا اور ان کی بے لوث اور بے غرض خدمت کی۔ یہی وہ ذات مقدس ہے جس نے اخوتِ
انسانی اور خدمتِ خلق کے لئے دور دراز ملکوں کی مسافتیں طے کر کے اور دشوار گذار راستوں
کی تکلیفیں جھیل کر دنیا کے مختلف خطوں کو اپنی تبلیغ رشد و ہدایت اور چارہ سازی اور غمگساری
کا مرکز بنایا۔ ان کے آستانے اور خانقاہیں بلا فرقِ مذہب و ملت سبھوں کے لئے سکون
کے سامان اور درد کے درماں بنے۔ عوام الناس جوق در جوق ان کے حلقہ بگوش ہونے اور
جبینِ عقیدت ان کے آستانے پر جھکاتی۔ ان کی انسان دوستی، شرافتِ نفسی، ایثار و قربانی
اور خلوص و محبت نے دشمن کو بھی دوست بنایا۔ ان کے اخلاقِ کریمانہ اور خلوصِ والہانہ
نے نہ صرف ان کا گرویدہ بنایا بلکہ عوام ان کے دامن سے وابستہ ہو کر ان کے حلقۂ ارادت میں
داخل ہو گئے وہ مذہبی اور روحانی پیشوا اور رہنما تسلیم کئے گئے۔ ان کی زبانِ فیض ترجمان سے
جو کلمات صادر ہوئے وہ زندگی کے لئے لائحۂ عمل اور مشعلِ راہ بنے۔ صوفیائے کرام کی بر
جماعتیں مدینۂ منورہ، مکۂ معظمہ، بغداد، عراق، بخارا، چشت، نیشا پور، بیت المقدس،
افغانستان، سمرقند، ہرات، بصرہ، تبریز، دمشق سے ہندوستان میں بھی عہد بہ عہد اپنا مشعل لے
کر کہیں خلوت نشیں اور کہیں جلوت نشیں ہوتی رہیں۔ کسی نے صحرا میں پناہ لی تو کسی نے دریا کے
کنارے اپنا بسیرا لیا تو کوئی کوہ و بیاباں میں قیام پذیر ہوا۔ نیچے زمین اور ۔ اوپر آسمان تھا
اور اللہ کے یہ برگزیدہ بندے یادِ الٰہی میں مشغول۔

ہندستان ہر دور میں دینی اور روحانی تعلیم کا مرکز رہا ہے اسی لئے ہندو، بودھ، جین مذاہب کے پیشواؤں نے بھی اسی خطہ کو اپنی روحانی تعلیمات کا مرکز بنایا۔ اسی طرح مسلمانوں نے بھی اسی خطہ کو رشد و ہدایت کے لئے منتخب کیا چنانچہ ہندوستان میں صوفیائے کرام کی آمد پانچویں صدی ہجری سے متواتر طور پر نظر آتی ہے اور انہوں نے ہندوستان کے مختلف صوبے مثلاً پنجاب، بہار، راجستھان، دہلی، دکن، گجرات، یوپی، بنگال، کشمیر غرض کہ جنوبی ہند اور شمالی ہند کے اکثر مقامات کو روحانی تعلیم اور رشد و ہدایت کے لئے منتخب کیا۔ جہاں سے صوفیائے کرام کے مختلف سلاسل کی تعلیمات اور رشد و ہدایت جاری و ساری ہوئیں۔ ان صوفیائے کرام کی شاخیں اور سلسلے مختلف انداز اور مختلف طرز فکر میں پھیلتے رہے اور یہ تمام شاخیں اصطلاحی طور پر سلاسل کے نام سے موسوم اور معروف ہیں۔ اس کی حیثیت اس باغ کی طرح ہے جس میں رنگ برنگ کے پھول کھلے ہیں اور جس طرح ہر پھول کا رنگ قسم قسم، خوشبو جدا جدا اور ساخت رنگ برنگ ہے اسی طرح ہر سلسلے کا اپنا اپنا اندازِ فکر اور جدا جدا طرزِ عمل ہے لیکن سب کا مقصد ایک ہی ہے اور وہ ہے تقربِ الٰہی، معرفتِ حق، تسلیم و رضا، انسان دوستی، خلوص و محبت اور ایثار و قربانی کا درس اور اس کے ذریعہ بقا کا مقام حاصل کرنا اور زندۂ جاوید ہو جانا ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ ہر سلسلہ کا اپنا اپنا اندازِ فکر ہے اور اس کی اپنی مخصوص کیفیتیں اور حالتیں ہیں۔ ان کی تعلیم کا بھی مختلف طریقہ کار ہے کسی سلسلہ میں داخل ہونے کے بعد سلوک کی مختلف منازل سے گذرنا پڑتا ہے تو کسی سلسلے میں داخل ہونے کے پہلے ہی ریاضت و مجاہدہ کی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔ کسی سلسلہ میں داخل ہونے کے لئے نہ صرف محنتِ شاقہ کرنی پڑتی ہے بلکہ امتحان و آزمائش سے بھی گذرنا پڑتا ہے اور بہت کد و کاوش کے بعد داخلے کی اجازت ملتی ہے تو بعض سلسلے ایسے ہیں جن کی رسائی میں زیادہ سلسلہ جنبانی کی ضرورت نہیں۔ لیکن سلسلے میں داخل ہوتے ہی ان کو ایسی ایسی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے جن کو برداشت کر لینا مخصوصین کے بس کی بات بھی نہیں۔ بعض سلسلے ایسے ہیں جن میں جذبہ

وستی کے سرور ہی سے مکیف ہو کر مقاماتِ سلوک طے ہو جاتے ہیں بعض سلسلے میں علم و عمل دونوں ہی سے متصف ہونا ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ ہر سلسلہ کا اپنا اپنا خاص اندازِ فکر ہے اور اس کی تعلیمات کے مختلف روش اور مسلک ہیں۔ لیکن سبھوں کا منبع و ملجا اور مرکز رحمۃ اللعالمین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت اور ان کی اتباع و سنت ہے۔

اگر ہم تمام مشاہیر سلاسل اور خانوادے کی کیفیت وکیت کا مشاہدہ کریں تو یہ صداقت بھی سامنے آتی ہے کہ ہر سلسلہ کے لئے ایک مخصوص مسلک اور اس کی تعلیمات کی منفرد نوعیت ہے۔ مثلاً سلسلۂ قادریہ میں تقویٰ اور طہارت کے علاوہ شریعت کی سختی سے پابندی ہے اور باطن کی آراستگی کے لئے ظاہر پر بھی گہری نظر ہے۔ خود سیدنا حضرت محبوب سبحانی عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف اس کی تعلیم دی بلکہ عملی طور سے اس کی رو شنی پر اس سختی سے کاربند رہے کہ شریعت کے عمل سے ایک شمہ برابر بھی کوئی تضاد ہوا تو طریقت کے اس عمل سے دور رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ سلسلۂ قادریہ کی روش بہت محتاط ہے۔

سلسلہ نقشبندیہ نے تو اپنی تعلیمات میں اس سے زیادہ بڑھ کر احتیاط کا قدم اٹھایا کہ داخل سلسلہ ہونے کے قبل ہی ریاضت و مجاہدہ کی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے اور یہ مراقبے اور اذکار و اشغال کے ذریعہ طالبِ راہ کو اس قابل بنا لیتے ہیں کہ اس سلسلہ کی تاب لاسکے اور اس کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر منازل و سلوک کی راہیں طے کر سکے۔ اسی لئے ان کی تعلیم کا مسلک نظر بر قدم ہے۔ اس سلسلہ کے بانی حضرت بہاؤ الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے ہر طرح پر آزمائش و امتحان کی کسوٹی پر پرکھ کر اپنے سلسلہ کی ترویج و اشاعت کی۔

سلسلۂ چشتیہ میں تقویٰ و طہارت تو ہے لیکن اس سلسلے کے مشائخین نے سختی نہ کی بلکہ تبلیغِ اسلام اور ترویج دین و اسلام کا ایک دلکش اور پرکشش اندازِ تعلیم اختیار کیا۔ انہوں نے جذب و مستی اور کیف و سماع کو ایسی جاذبیت کے ساتھ پیش کیا کہ جوق در جوق اس سلسلہ میں عقیدت مند داخل ہونے لگے اور مقبولیتِ عامہ کا یہ عالم ہوا کہ اس کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ و ترویج کافی ہوئی۔ اس سلسلے میں جو مخصوصین ہیں ان کو حسبِ احتیاط

کا قدم اٹھانا پڑتا ہے اور جس ایثار و قربانی سے گذرنا پڑتا ہے اس کا تصور بھی جان لیوا ہے۔
اس سلسلے کے مشائخین کی ظاہری زندگی کچھ اور نظر آتی ہے اور باطنی زندگی کی روش اتباع سنت رسول اور عرفان حق پر اس طرح عمل پیرا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ خطہ ہندوستان میں اس سلسلہ نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ حیرت انگیز اور زندۂ جاوید ہیں۔ اس سلسلہ کا واسطہ اور رابطہ عوام سے زیادہ ہے اور مقبولیت کا یہ انداز ہے کہ بلا فرق مذہب و ملت سب اس کے شیدائی اور اس پر فریفتہ ہیں۔

سلسلہ فردوسیہ میں شریعت کی پابندی کے ساتھ ساتھ علم و عمل کی آراستگی بھی لازمی ہے۔ خود حضرت مخدوم جہاںؒ جو اس سلسلے کے عظیم المرتبت بزرگ تھے وہ خود بہت بڑے صاحب علم اور صاحب تصانیف تھے اس لئے انہوں نے علم پر زیادہ زور دیا اور شریعت کی پیروی لازمی قرار دی۔ امیر المومنین امام المتقین حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ کی تعلیمات من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ کی اس طرح تعلیم دی گئی ہے کہ اس سلسلہ کے مشائخین علم ظاہری اور باطنی سے آراستہ ہونے کے باوجود اپنے میں اس طرح گم ہیں کہ گمنام پسندی ان کا خاص مسلک ہو گیا ہے۔

سلسلہ سہروردیہ کی ابتدا تو عراق کے قصبہ سہرورد سے ہوئی لیکن اس کی ترویج و اشاعت بغداد میں زیادہ ہوئی۔ اس لئے کہ حضرت شیخ الشیوخ کا قیام زیادہ تر بغداد ہی میں رہا۔ ہندوستان میں ملتان، بنگال، بہار، یوپی اور مدھیہ پردیش میں اس کی وسعت کافی ہوئی۔ اس سلسلے میں علم و عمل دونوں پر توجہ دی جاتی ہے لیکن پیروی رسول اور محبت رسول پر زیادہ زور ہے۔ پیروی راہ حق اور اتباع مسلک خاص اصول ہیں۔ حضرت شیخ الشیوخ رحمۃ اللہ علیہ عوارف المعارف ص۴۴ میں فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ شیخ الاسلام ابونجیب سہروردیؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "میرا فرزند وہی ہے جو میرے طریقے پر چلے اور میری راہ ہدایت اختیار کرے"۔

مختصر یہ کہ اس طرح ہر تمام سلاسل میں اپنے اپنے انداز فکر سے روش و مشرب پر زیادہ زور ہے۔ کسی سلسلہ میں شریعت و طریقت کے ساتھ تقویٰ و طہارت کی زیادہ پابندی ہے تو کسی میں وجد و سماع اور کیف و سرور کا زیادہ خیال۔ کسی سلسلے میں علم و عمل کے شغف کے

ساتھ ساتھ استتار اور گمنام پسندی پر زیادہ توجہ ہے تو کسی میں ریاضت ومجاہدہ کی زیادہ لگن ہے۔ کسی میں ذکر وشغل اور مراقبہ کی زیادہ سے زیادہ تعلیم ہے تو کسی میں تسلیم ورضا اور ایثار وقربانی کا درس، کوئی بظاہر مخلوق کی ملامت سے مست قلندر، غرض کہ تمام سلسلے میں اپنی اپنی کیفیت وحالات کے لحاظ سے تعلیم دی جاتی ہے۔

صوفیائے کرام کے یہ سلاسل تذکرۂ مشائخ اور صوفیائے کرام کی تصانیف میں مختلف طریقوں پر ترتیب دیکر جمع کئے گئے ہیں۔ بعض صوفیا نے طبقات کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے تو بعض نے وطنیت کے اعتبار سے، بعض مشائخین نے زمانہ کے اعتبار سے تو بعض نے تعلیمات اور روش کے اصول سے۔ اس لئے سلاسل کی تاریخ میں کوئی ربط اور تسلسل نہیں۔

کشف المحجوب جو حضرت شیخ علی بن عثمان ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش ہجویری لاہوریؒ کی گرانقدر تصنیف ہے اور فارسی میں تصوف کی قدیم ترین کتاب۔ اس کے چودہویں باب میں صوفیا کے مختلف سلسلے اور ان کے اصول اور باہمی اختلافات کا ذکر ہے۔ اس وقت تک حضرت شیخ علی ہجویریؒ کے خیال میں کل بارہ سلسلے تھے ان میں سے دس مقبول اور اہلِ حق تھے اور باقی دو مردود اور اہل باطل تھے۔

بزرگانِ دین کے متعدد تذکرے ہیں مثلاً تذکرۃ الاولیا، نفحات الانس۔ مرآۃ الاسرار مصنفہ عبدالرحمٰن چشتی، گلزار ابرار مصنفہ محمد غوثی شطاری، کلمات الصادقین مصنفہ محمد صادق ہمدانی، اخبار الاصفیا مصنفہ عبدالصمد میں بزرگوں کے تذکرے تو ہیں لیکن سلاسل کے اعتبار سے تقسیم نہیں۔ البتہ اخبار الاخیار مصنفہ عبدالحق محدث دہلویؒ میں مشائخ کے حالات کی ترتیب سلسلوں کے اعتبار سے نہیں بلکہ کل مشائخ کو زمانہ کے لحاظ سے تین طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سفینۃ الاولیا میں شہزادہ دارا شکوہ نے سلاسل کے اعتبار سے اپنی تصنیف کو ترتیب دینے کی کوشش کی ہے لیکن اس میں بھی دوسرے سلاسل کے بزرگوں کے حالات خلط ملط ہو گئے ہیں۔ سلسلہ کی تقسیم اس طرح پر کی ہے (۱) سلسلہ عالیہ قادریہ (۲) سلسلہ شریفہ خواجگان بزرگوار (۳) سلسلہ شریفہ چشتیہ (۴) سلسلہ کبرویہ (۵) سلسلہ سہروردیہ (۶) متفرقہ۔ ابوالفضل نے اپنی تصنیف آئینۂ اکبری میں ہندستان میں

چودہ[۱۴] سلاسل کا ذکر کیا ہے لیکن حیرت ہے کہ اس نے بھی سلسلہ قادریہ اور نقشبندیہ جیسے مشہور سلاسل کی دوسرے سلسلے میں شمولیت کر دی۔

بعض تذکرہ نگاروں نے صرف چار مشہور سلاسل کا تذکرہ کیا ہے تو بعض نے چھ کا۔ حیرت ہے کہ پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی نے ہندوستان میں صرف چھ سلاسل کا ذکر کیا ہے اور تحریر کیا ہے کہ "ہندوستان میں صرف مندرجہ ذیل چھ ہی سلاسل نے کام انجام دیئے اور وہ یہ ہیں (۱) چشتیہ (۲) سہروردیہ (۳) قادریہ (۴) شطاریہ (۵) نقشبندیہ (۶) فردوسیہ"

بزرگوں کے قلمی سفینوں میں اپنے اپنے طور پر سلاسل کے اعتبار سے صوفیائے کرام کے نام نامی تحریر ہیں۔ ہمارے خاندان میں ۱۹ سلاسل کی اجازت و خلافت مختلف بزرگوں سے ملی ہے، مرکزی حیثیت بھی پیش کی گئی ہے جس سے یہ سلاسل مشہور ہوئے ہیں۔ بعد میں ان سلاسل کی مختلف شاخیں پیدا ہوئی ہیں اور یہ اس لئے بھی کہ اس سلسلے میں جس بزرگ کی زیادہ شہرت اور وسعت ہوئی ہے، ان ہی سے وہ سلسلہ منسوب کر دیا گیا ہے۔ جیسے سلسلہ قادریہ میں قادریہ شمسیہ، قادریہ طیبیہ، قادریہ مجددیہ، قادریہ احمدیہ، سلسلہ چشتیہ میں چشتیہ صابریہ، چشتیہ نظامیہ، چشتیہ اشرفیہ، چشتیہ مجددیہ۔ اس طریقے سے نقشبندیہ سے نقشبندیہ مجددیہ، فردوسیہ سے فردوسیہ بلخیہ، فردوسیہ شعیبیہ، فردوسیہ دولتیہ وغیرہ۔ غرض کہ اسی طرح جن بزرگوں سے اس سلسلے کی وسعت اور شہرت زیادہ ہوئی ہے ان ہی کی ذات کا اضافہ کر دیا گیا ہے لیکن یہ تمام سلاسل اسی ایک سلسلہ کی شاخ ہیں۔ ان تمام سلاسل کا مطمح نظر و مکتبۂ خیال رشد و ہدایت کے اہم فریضے کو انجام دینا ہے اور اس طرح عرب و عجم کے اکثر مقامات میں اس کی ترویج و اشاعت ہوئی۔ یہ تمام سلاسل اسی ذات اقدس سے موسوم ہیں جن سے ان کا آغاز ہوتا ہے اور اس کا طرزِ فکر اور لائحۂ عمل مختلف رنگ و روپ میں اجاگر ہوتا ہے۔

سلسلہ قادریہ

سلسلہ قادریہ جسے ام السلاسل بھی کہتے ہیں غوث پاک حضرت سیدنا محبوب سبحانی عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے۔ اس سلسلہ میں شریعت کی بڑی پابندی ہے اور مکروہاتِ دنیا سے کنارہ کشی، ریاضت و مجاہدہ

اور تسلیم و رضا کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ حضرت غوث پاکؒ نے اپنی تصنیف فتوح الغیب میں اس سلسلے کی تعلیم دی ہے۔

فتوح الغیب کے باب ۵۷ میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے فرزند سیف الدین عبدالوہاب کو وصیت فرمائی ہے اور دستورالعمل بتایا ہے جس سے انسان عارف کامل بن سکتا ہے۔ اس میں پابندی شریعت، پیروی سنت، ضبطِ نفس اور مجاہدہ اور ادائے حقوق العباد کی تعلیم دی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

> "میں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ کا تقویٰ اور طاعت اختیار کرو، اور احکام شریعت کی پابندی لازم رکھو، اور سینہ کو (خباثتِ نفس سے) صاف رکھو اور نفس میں جوانمردی رکھو، اور کشادہ رو رہو، اور جو شئے عطا کرنے کے قابل ہو اسے عطا کرتے رہو اور ایذادہی سے باز رہو اور خود آزارِ خلق کا تحمل کرتے رہو، اور آدابِ درویشی نگاہ میں رکھو، اور بزرگوں کی بزرگی داشت کرتے رہو، برابر والوں سے حسنِ معاشرت رکھو، خوردوں کو نصیحت کرتے رہو، اپنے رفیقوں سے جنگ نہ کرو، ایثار کو اپنے اوپر لازم کرلو، ذخیرۂ مال فراہم کرنے سے بچو۔"[1]

اس سلسلے کی ترویج و اشاعت بغداد سے ہوئی اور اسلامی دنیا میں اس کی وسعت اور شہرت اس قدر ہوئی کہ عرب و عجم یعنی مدینہ منورہ ہو یا ایران، افغانستان ہو یا ہندستان غرض کہ ہر جگہ بالخصوص ہندستان میں اس کی اتنی وسعت و مقبولیت ہوئی کہ کوئی بھی بڑی یا چھوٹی خانقاہ ایسی نہیں ہے جس میں اس کی ترویج و اشاعت نہ ہوئی ہو۔ اور اس سلسلے کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ حضرت شیخ موصوف کا جس ماہ میں وصال ہوا ہے وہ مہینہ گیارہویں شریف کے نام سے مشہور ہے اور ہر خاص و عام اس سلسلے کا معترف اور معتقد۔

اس سلسلہ قادریہ کی وسعت اور ترویج و اشاعت ان کے صاحبزادوں اور خلفاء کے ذریعہ زیادہ ہوئی جن میں حضرت عبدالوہابؒ، حضرت عبدالرزاقؒ، حضرت عبدالعزیزؒ بن عبدالقادرؒ

---

[1] فتوح الغیب ص ۳۹۵ از تصوف اسلام مصنفہ عبدالماجد دریاآبادی ص ۱۱۰

جیلانی، حضرت عبدالقاہر نجیب الدین سہروردیؒ حضرت شیخ الشیوخؒ، حضرت ابو ابراہیم المقدسیؒ وغیرہم سے ہوئی۔

۲۔ سلسلہ چشتیہ

سلسلہ چشتیہ کی نسبت حضرت ابو اسحاق چشتیؒ سے ہے۔ لیکن شہزادہ دارا شکوہ نے اپنی تصنیف سفینۃ الاولیاء میں حضرت ابو اسحاق چشتیؒ کے مرید اور جانشین حضرت خواجہ ابو احمد چشتیؒ کو حلقہ چشتیہ کا سردار لکھا ہے۔ اس سلسلے کی ترویج و اشاعت مقام چشت سے شروع ہوئی اور سجستان، دمشق، سجستان، خراسان اور نیشاپور سے ہوتی ہوئی ہندوستان پہنچی اور ہندوستان میں اس سلسلے کو فروغ حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی اجمیریؒ کی ذات گرامی سے ہوا۔ اس سلسلے میں ظاہر سے زیادہ باطن پر زور ہے۔ وجد و سرمستی پیدا کرنے کے لئے مجلس سماع سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے اس سلسلے میں مجلس سماع اور قوالی کا زیادہ شغف ہے اس سلسلے کے معتقد بلا فرق مذہب و ملت ہندوستان کے عوام و خواص دونوں ہیں۔ تمام سلاطین ہند بھی چشتی بزرگوں کے آستانے کی حاضری کو اپنے لئے موجب سعادت سمجھتے رہے ہیں۔ ان کی خانقاہوں اور مزاروں پر عوام و خواص دونوں ہی میں محبت اور عقیدت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس سلسلے کی اشاعت شمالی ہند اور جنوبی ہند میں کثرت سے ہوئی۔ حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت علاء الدین علی احمد صابر کلیریؒ اور آپ کے خلفاء سے اس سلسلے کی کافی شہرت ہوئی۔ دہلی میں حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ سے اور آپ کے جانشین سید محمد بندہ نواز گیسو درازؒ سے، گلبرگہ شریف دکن میں اس کی کافی مقبولیت ہوئی اور جنوبی ہند میں چشتی بزرگوں نے اس سے اپنے سلسلے کو بڑی وسعت دی۔ صوبۂ بنگال میں حضرت علاء الحق پنڈویؒ اور آپ کے صاحبزادے حضرت نور قطب عالم پنڈویؒ سے اس سلسلے کو بہت فروغ ہوا۔ حضرت علاء الحقؒ کے خلیفہ و مجاز حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانیؒ سے، حضرت نور قطب عالم پنڈویؒ کے مرید و خلیفہ حضرت مخدوم حسام الحق مانکپوریؒ اور ان کے مرید و مجاز حضرت راجے سید حامد مانکپوریؒ اور فتح اللہ اودھیؒ سے، حضرت مخدوم طیب بنارسیؒ سے اور حضرت دیوان محمد رشید جونپوریؒ سے یوپی کے خطے میں اس سلسلے کی وسعت ہوئی بلکہ اس کی شہرت ہندوستان گیر ہوئی۔

صوبہ بہار میں بھی حضرت آدم صوفیؒ خلیفہ مجاز حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کی درگاہ جیو ٹھلی، حضرت فرالدین طوطیہ بخشؒ خلیفہ مجاز نور قطب عالم پنڈویؒ، حضرت جمال الحق بندگی مصطفےٰ چمنی بازاہ پورنیہ وغیرہ کے ذریعہ اس سلسلے کی ترویج زیادہ ہوئی اور اس سلسلے کے اخلاقِ حسنہ اور فیضانِ عام نے خواص وعوام کو اپنا گرویدہ بنا ڈالا۔

۲۔ سلسلہ سہروردیہ حضرت شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب سہروردیؒ کے برادر زادہ و مرید جانشین حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ سے سلسلہ سہروردیہ منسوب اور مشہور ہے۔ آپ مشہور عارف اور صاحب تصنیف بزرگ گذرے ہیں۔ آپ کی مشہور تصنیف عوارف المعارف ہے۔ یہ کتاب فن تصوف پر گرانقدر تصنیف ہے اور جماعتِ صوفیہ میں مستند تسلیم کی جاتی ہے اور اس کا مطالعہ راہِ تصوف میں ضروری ہے۔

شیخ الشیوخ کے نزدیک تزکیہ قلوب و تصفیہ نفوس براہِ راست تعلیماتِ مصطفویؐ کا ثمرہ ہے اور جو شخص اس سرچشمہ رشد و ہدایت سے جتنا زیادہ سیراب ہوا اسی قدر صفائے قلب و تزکیہ نفس سے بھی وہ زیادہ بہرہ اندوز ہوا۔ اس سلسلے میں پیروی رسولؐ اور محبتِ الٰہی کی تعلیم دی گئی ہے، بلکہ پیروی رسول عین محبتِ الٰہی ہے۔ جیسا کہ عوارف المعارف صفحہ ۲۶ میں فرماتے ہیں :-

> "پس جو شخص جتنا زیادہ متبع رسول صلعم ہے، اسی قدر زیادہ وہ محبتِ الٰہی کا بھی حصہ دار ہے اور صوفیا ہی نے اسلامی گروہوں میں سب سے زیادہ بڑھ کر اتباعِ رسول کی ہے۔"

عوارف المعارف رہروانِ تصوف کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ اس سلسلے کی مقبولیت نہ صرف دمشق، بخارا اور سہرورد میں ہوئی بلکہ صوبہ پنجاب کے مشہور خطہ ملتان میں حضرت شیخ الشیوخ کے خلیفہ و مجاز حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے ذریعہ ہوئی۔ بنگال میں حضرت شیخ الشیوخ کے دوسرے خلیفہ حضرت خواجہ احمد دمشقیؒ اور اس سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت جلال الدین بخاریؒ کے ذریعہ اس کو کافی فروغ ہوا۔ اس سلسلہ کے دوسرے مشہور بزرگ امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ بھی ہیں جن کے ذریعہ خطہ کشمیر میں اس کی وسعت

اور شہرت ہوئی۔

صوبہ بہار میں حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کے نانا حضرت شہاب الدین پیر جگ جوتؒ، کچی درگاہ پٹنہ ضلع عظیم آباد اور منیر شریف میں حضرت مخدوم جہاںؒ کے والد حضرت مخدوم احمد یحییٰ منیریؒ، بہار شریف میں حضرت مخدوم احمد چرم پوش سہروردیؒ مشہور سہروردی بزرگ ہیں اور ان کے ذریعہ اس سلسلہ کو زیادہ فروغ ہوا۔ قطب الاقطاب حضرت غریب اللہ حسین دھکڑ پوشؒ، حضرت مخدوم ضیاء الدین صوفی چند پوسیؒ اور حافظ متخلص جلال ناصحی سارنیؒ نے اس سلسلہ کو مقبولِ عام و خاص بنایا۔

۴۔ سلسلہ نقشبندیہ

یہ سلسلہ حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبندؒ سے منسوب ہے۔ اسی لئے آپ کو سلسلہ خواجگان نقشبندیہ کا سرتاج کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے کی نسبت خلیفۃ المسلمین حضرت سیدنا ابو بکر صدیقؓ سے ہے۔ آپ شریعتِ مطہرہ کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ اسی لئے شریعت پر زیادہ زور ہے اور ظاہری و باطنی ہر طرح پر شریعت کی پابندی لازمی ہے۔ تقویٰ کے ساتھ ساتھ احتیاط کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ اسی لئے ان کا لازمہ ہے کہ "نظر برقدم، خلوت در انجمن، سفر در وطن"۔ اس سلسلے میں داخلے سے پہلے ریاضت، مجاہدہ، مراقبہ و ذکر و اشغال کی صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے کی وسعت اور شہرت مکہ معظمہ، بخارا، مشہد، روسی ترکستان، خوارزم، سمرقند میں زیادہ ہوئی۔ ہندوستان میں اس کی ترویج و اشاعت دسویں صدی ہجری کے مشہور بزرگ حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے عہد اکبری میں زیادہ ہوئی۔ آپ کے بعد ان کے خلیفہ امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندیؒ نے اس سلسلے کی بڑی خدمت کی اور اس کو مقبول عام بنایا۔ اور پھر یہ سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ کے نام سے بھی مشہور ہو گیا۔ گیارہویں صدی ہجری میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی علمی اعتبار سے اس کو بہت فروغ دیا اور اس کی وسعت ہندستان کے مختلف مقامات میں اس طرح ہوئی کہ آج بھی صاحبِ علم اس سلسلہ میں داخل ہو کر اکتسابِ فیض کرتے ہیں۔

۵۔ سلسلہ کبرویہ

سلسلہ کبرویہ جس کی نسبت طریقت و تصوف میں یکتائے روزگار حضرت نجم الدین کبریٰ ولی تراشؒ سے ہے حضرت نجم الدین کبریٰ حضرت ابو نجیب عبدالقاہر سہروردیؒ کے مرید اور مجاز و خلیفہ تھے۔ تذکرۂ مشائخ میں تحریر ہے کہ حضرت ابو نجیبؒ نے علم طریقت کے اسرار و رموز آپ پر منکشف کئے، مرید کیا اور خلافت اجازت عطا فرمائی۔ پھر پیشوائے مشائخ عالم بنا کر رشد و ہدایت کے لئے رخصت فرمایا۔ آپ بڑے محدث ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے مفسر بھی تھے۔ آپ کی تعلیمات میں تقویٰ اور تفقہ کے ساتھ ساتھ علم شریعت اور طریقت پر بھی زیادہ زور ہے۔ سلسلۂ کبرویہ کو اتنا فروغ ہوا کہ مقام خوارزم میں آپ کی خانقاہ میں بہ یک وقت چھ ہزار مریدین راہِ طریقت کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ چوں کہ آپ بہت بڑے صاحب علم تھے اس لئے آپ کے سلسلے میں علم کا زیادہ شغف ہے۔ آپ کے سلسلے سے راہِ طریقت کی ایک نئی شاخ پھوٹی اور وہ سلسلہ فردوسیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ یعنی آپ کے مرید و جانشین حضرت سیف الدین باخرزیؒ اور ان کے مرید و جانشین خواجہ بدرالدین سمرقندیؒ اور ان کے مرید و جانشین حضرت خواجہ رکن الدین فردوسیؒ سے سلسلہ فردوسیہ کا آغاز ہوا اور اس نے اس سلسلے کو کافی فروغ دیا۔ یہ سلسلہ سہروردیہ سمرقند اور خوارزم تک بہت پھیلا، لیکن ہندوستان میں اس نے فردوسیہ کا رنگ و روپ اختیار کر لیا۔

۶۔ سلسلہ فردوسیہ

اس سلسلہ فردوسیہ کو بعض مصنفین نے حضرت نجم الدین کبریٰ ولی تراشؒ سے منسوب کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے کی نسبت حضرت خواجہ بدرالدین سمرقندیؒ کے مرید و جانشین حضرت خواجہ رکن الدین فردوسیؒ سے ہے۔ اس لئے کہ مناقب الاصفیاء مصنفہ حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ (عم زادہ حضرت مخدوم جہاںؒ) میں تحریر ہے کہ :۔

"بآنکہ خواجہ رکن الدین در ہند چناں بر آمد کہ بہ عرب و عجم رسیدہ شجرۂ معظم پیران را بلکہ بنام آوردند۔ پیرانِ فردوس گفتند و پیوستگان ایں این شجرہ را در ہند بنام او می خوانند فردوسی می گویند کہ الالقاب

تتنزل من السماء ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

خواجہ رکن الدین ہندستان میں اس شان سے آئے کہ عرب و عجم میں ان کا فیض پہنچا۔ اپنے پیرانِ طریقت کے شجرہ کا سکہ جاری کیا اور وہ مشائخ فردوسی کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس شجرہ کے وابستگان ہندستان میں اپنے سلسلہ کو اسی نام سے پکارتے ہیں اور فردوسی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ پرانا مقولہ ہے کہ نام آسمان سے اترتے ہیں یہ اللہ کا فضل خاص ہے جس کو چاہے دے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہی سے سلسلہ فردوسیہ کی ابتدا ہوئی ہے۔ اگر چہ تین واسطوں سے اوپر اس سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت نجم الدین کبریٰ ولی تراش ہیں۔ اس سلسلہ کی وسعت و شہرت صوبہ بہار کے جلیل القدر بزرگ حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی ذات اقدس سے ہوئی جنہوں نے علمی اور روحانی طور پر دین حق کی خدمت کی اور اخوت و محبت کا درس عالم انسانی کو دیا اور خدمت خلق کو اپنا فرض اولین سمجھا۔ آپ کے تصانیف و ملفوظات رہروانِ معرفت و طریقت کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ سلسلہ فردوسیہ میں علم طریقت کے ساتھ ساتھ علم شریعت کا حصول بھی فرض سمجھا جاتا ہے۔ زہد و تقویٰ کے ساتھ ساتھ تسلیم و رضا کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ اخلاص و محبت کے ساتھ ساتھ اخوت و انسانیت کا بھی درس دیا جاتا ہے۔ عاجزی و انکساری و گمنام پسندی اس راہ کی پہلی منزل ہے۔ تصنیف و تالیف کا اس قدر شغف و ذوق ہے کہ مخدوم جہاں کے بعد آپ کے تمام جانشینوں نے اپنے پیر و مرشد کی سنت پر عمل کیا۔ حضرت مولانا مظفر بلخیؒ، حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید بلخیؒ، حضرت مخدوم حسن دائم جشن بلخیؒ اور حضرت مخدوم احمد لنگر دریا بلخیؒ اور آپ کے جانشینوں نے خصوصاً خانوادہ بلخیہ نے اس سلسلے میں بڑی وسعت پیدا کی اور اسے چار چاند لگایا۔ دسویں صدی ہجری میں منیر شریف کے سلسلہ فردوسیہ کے عظیم المرتبت بزرگ حضرت مخدوم شاہ دولتؒ کا فیضانِ فردوسیہ اس قدر مقبول و مشہور ہوا کہ عہد اکبری و جہانگیری میں سلطنتِ مغلیہ کے امراء گورنر وغیرہ حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ عبدالرحیم خان خاناں، ابراہیم خان کانکڑ صوبہ دار گجرات۔ راجہ مان سنگھ اسی در سے فیضیاب ہوتے

۷۔ سلسلہ زاہدیہ

مختلف سفینوں میں اس سلسلہ کا نام سلسلہ گازرونیہ بھی ہے اس سلسلے کے امام حضرت ابواسحٰق شہریار گازرونیؒ ہیں۔ بعد میں اس کی نسبت حضرت خواجہ شہاب الدینؒ کبیر امام کعبہ کے صاحبزادے اور جانشین حضرت خواجہ فخرالدین محمداور بزرگ زاہدیؒ سے کی جاتی ہے اس سلسلے میں پابندی شریعت کے ساتھ ساتھ انکساری وسادگی، مہمان نوازی اور فقرانوازی کی تعلیم دی جاتی ہے بظاہر جلالی شان ہے لیکن باطنی طور پر حدتِ قلب کی وجہ سے جلالی کیفیت طاری رہتی ہے۔ اس سلسلے کو فروغ بغداد، تبریز، سمرقند میں زیادہ ہوا۔ ہندوستان میں اس کا فروغ حضرت خواجہ شہاب الدین حق گو شہید زاہدیؒ سے ہوا ہے۔ اس لئے کہ یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے سلطان محمد تغلق والیٔ ہندوستان کے فلسفہ الملک عادل کو تسلیم نہیں کیا۔ اس بات پر ناراض ہو کر سلطان محمد تغلق نے انکو اپنے قلعہ سے گرا کر شہید کر دیا۔ اسی بنا پر حق گو کے نام سے مشہور ہوئے۔ ہندوستان میں میرٹھ، بنگال، یوپی اور بہار میں اس سلسلے کی بہت وسعت ہوئی۔ حضرت مخدوم بدرالدین بدرعالم زاہدیؒ چاٹگام سے بہار شریف مخدوم جہاںؒ کی طلبی پر آئے۔ آپ کے چہرے پر جلال وجمال کی ایسی کیفیتیں مرتسم رہتیں کہ کوئی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ان کے خلفاء اور اخلاف نے اس سلسلے کو بہت زیادہ فروغ دیا۔ رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ مشرقی یوپی اور صوبہ بہار کے شمالی حصہ میں اتنا مقبول عام ہے کہ بلا فرق مذہب و ملت آج بھی اس سلسلے کے بزرگوں کے آستانے فیضِ عام کے لئے مرجع خلائق ہیں۔

۸۔ سلسلہ ابوالعلائیہ

یہ سلسلہ حضرت سیدنا امیر ابوالعلا اکبرآبادیؒ سے منسوب ہے۔ اصل میں یہ سلسلہ نقشبندیہ کی شاخ ہے اس لئے کہ آپ کے چچا حضرت امیر سید عبداللہ اکبرآبادیؒ سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگ ہیں۔ عبداللہ عن حضرت خواجہ محمد یحییٰ عن حضرت خواجہ عبدالحق المشہر بحی الدینؒ عن خواجہ ناصرالدین عبیداللہ احرارؒ عن حضرت خواجہ مولانا یعقوب چرخیؒ عن حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبندؒ۔

حضرت سیدنا ابوالعلاؒ دسویں صدی ہجری کے مشہور بزرگ ہیں جو عہد اکبری میں عہدۂ نظامت پر متمکن تھے اور منصب سہ ہزاری سے ممتاز ہوئے۔ عہد جہانگیری میں آپ نے اس منصب

کو چھوڑ دیا اور مسند فقر و قناعت پر متمکن ہوئے۔ آپ نے بردوان سے آگرہ جاتے ہوئے منیر شریف میں حضرت مخدوم شاہ دولت منیریؒ سے ملاقات کی اور فیوضِ روحانی سے مالامال ہوئے۔
اس سلسلہ میں عطا و بخشش اور سخاوت کی خاص طور پر تعلیم دی جاتی ہے۔ ظاہری وجاہت اور شان و شکوہ کے پردے میں فقیری پوشیدہ ہے۔ وجد و سماع کا بھی خاص شغف ہے۔ سلسلہ ابوالعلائیہ کو ہندوستان میں کافی فروغ ہوا۔ مدھیہ پردیش، گجرات اور یوپی میں اس کی بڑی وسعت ہوئی لیکن صوبہ بہار میں اس سلسلے کے ایک عظیم المرتبت مشہور بزرگ حضرت مخدوم منعم پاکبازؒ گیارہویں صدی ہجری کے ہیں ان کے فیوض سے اس کی بڑی مقبولیت ہوئی۔ آپ کے بعد آپ کے خلفا میں حضرت غلام حسین منعمیؒ، مخدوم حسن علیؒ، حضرت رکن الدین عشقؒ، حضرت مولانا حسن رضاؒ اور حضرت صوفی دائم شاہؒ اور ان کے خلفاء نے اس سلسلے کو اور فروغ دیا اور ہر خانقاہ میں اس کے فیوض جاری و ساری ہوئے۔

حضرت منعم پاکبازؒ عن حضرت میر سید اسد اللہؒ عن مولانا شاہ محمد فرہاد ابوالعلائیؒ عن حضرت سید دوست محمد ابوالعلائیؒ عن حضرت سیدنا میر ابوالعلا اکبر آبادیؒ۔

۹۔ سلسلہ شطاریہ

یہ سلسلہ حضرت شیخ عبداللہ شطار بن حسام الدین النوری البخاریؒ سے منسوب ہے۔ آپ حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کی اولاد میں سے ہیں اور سلسلہ ارادت کا تعلق حضرت خواجہ بایزید بسطامیؒ سے ہے اسی سبب سے اس سلسلہ کو ایران و توران میں عشقیہ اور دارالملک روم میں بسطامیہ کہتے ہیں۔ آپ حضرت شیخ محمد بن عارف خارپانی العشقیؒ سے مرید ہیں۔ حضرت شیخ عبداللہ شطار شاہانہ لباس زیب تن کرتے اور تزک و احتشام کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ نویں صدی ہجری کے آپ مشہور بزرگ ہیں۔ آپ ہی سے حضرت ابوالفیض قاضن علا شطاریؒ نے خرقہ خلافت پہنا اور پھر آپ کے ذریعہ اس سلسلے کی ترویج و اشاعت کثرت سے ہوئی۔ شمالی بہار میں آپ کے صاحبزادے حضرت ابوالفتح ہدیۃ اللہ پیر سرمستؒ اور ان کے مرید و خلیفہ شیخ ظہور حاجی حمید الدین حضورؒ سے اس سلسلے کی وسعت ہوئی۔ پھر حضرت ظہور کے مرید و مراد ہندوستان کے مشہور بزرگ حضرت سید محمد غوث گوالیاری شطاریؒ کی ذات اقدس سے

ہندکبر سطح پر اس سلسلے کی وسعت ہوئی۔ حضرت غوث گوالیاریؒ کے بڑے بھائی حضرت شیخ پھولؒ ہیں، ان کا شہنشاہ جہانگیر بہت معتقد تھا اس لئے ہندوستان کے مختلف مقامات میں خصوصیت کے ساتھ آگرہ، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، یوپی اور بہار میں اس کی وسعت و شہرت بہت زیادہ ہے اور عہد جہانگیری میں اس سلسلے کا بہت فروغ ہوا۔ شیخ وجیہ الدین علوی گجراتیؒ نے بھی اس کو کافی ترقی دی۔ ذکر و اشغال اور مراقبے کی تعلیم اس میں اس طور پہ دی جاتی ہے کہ جلد منازلِ سلوک طے ہو جاتے ہیں۔

۱۰۔ سلسلہ مداریہ

یہ سلسلہ حضرت شیخ بدیع الدین مدار مکن پوریؒ سے منسوب ہے۔ حضرت موصوف کی عمر شریف ۳۹۶ برس کی تھی جس کی وجہ سے یہ سلسلہ بہت کم واسطوں سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ آپ کے پیر و مرشد حضرت شیخ طیفور شامیؒ ہیں اور ان کے پیر و مرشد شیخ امین الدین شامیؒ ہیں اور ان کے پیر و مرشد حضرت شیخ عبداللہ علمبر دارمکیؒ ہیں اور ان کے پیر و مرشد حضرت امیر المومنین سیدنا ابو بکر صدیقؓ ہیں۔ آپ نے دور دراز ملکوں کا سفر کیا اور برابر سفر ہی میں رہے اور یہی سلسلے کی شہرت کا ضامن ہوا۔ کاظمین، بغداد، نجف اشرف ہوتے ہوئے ہندوستان تشریف لائے اور ہندوستان میں گجرات، اجمیر آئے اور اجمیر سے کالپی، جونپور ہوتے ہوئے کانپور پہنچے۔ اور مکن پور میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ سے سلسلہ مداریہ کو، آپ کی زندگی ہی میں فروغ حاصل ہوا۔ اس سلسلے کی تعلیم یہ ہے کہ اول اپنے آپ کو پہچانو تو خدا کو پہچان لوگے۔ خود حضرت بدیع الدینؒ فرماتے ہیں کہ:۔

> "تم کو یہ خیال کرنا چاہئے کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو، کہاں جانا ہے۔ اس عالم میں کس لئے آئے تھے اور خداوند تعالیٰ نے تم کو کس لئے پیدا کیا، نیک بختی اور بدبختی کیا ہے اول تم کو ان چیزوں سے آگاہ ہونا چاہئے اور تمہاری صفات بعض حیوانی ہیں، بعض شیطانی بعض ملکی"۔

> "تم کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ تمہاری اصل صفات کون ہیں۔ یاد رکھو! کھانا پینا، سونا، فربہ ہونا، غصہ کرنا یہ حیوانی صفات ہیں، مکر و فریب کرنا، فتنہ برپا

کرنا یہ شیطانی صفات ہیں۔ اگر ان صفات کے تم تابع ہو گئے تو حق تعالیٰ کی معرفت
تم کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہاں! اگر صفاتِ ملکوتی تم حاصل کر لو گے تو کیا عجیب کہ
معرفتِ خداوندی سے تمہارا قلب روشن ہو جائے۔ تم کو کوشش کرنی چاہیے
کہ صفاتِ حیوانی و شیطانی سے نکل کر صفاتِ ملکوتی حاصل کرو۔[1]

ہندوستان میں آپ کے خلفاء۔ سید ابوالحسن طیفور، سید اسمٰعیل جونپوری اور حضرت
قاضی شہاب الدینؒ پرکالۂ آتش سے اس سلسلے کو فروغ ہوا۔ صوبہ بہار میں آپ کے خلفاء میں
حضرت جمال الدین جان من جنتیؒ ہیں۔ ان کا مزار اقدس تلپسہ ضلع بالندہ میں ہے اور اس سلسلے
کے بزرگ حضرت لودی شاہ دیوانؒ اسلام پور ضلع نالندہ میں قابلِ ذکر ہیں۔ آپ نے حضرت
فضل اللہ بدخشانیؒ سے فرمایا کہ:۔

"اے عزیز! تم نے اس کوچے میں قدم رکھا ہے جو ایک دریائے ناپیدا
کنار ہے جس میں بلا اندر بلا ہے جو لوگ ہشیار رہتے ہیں وہ جرأت و ہمت کو
اپنا شعار کر کے پار ہو جاتے ہیں اور حیاتِ ابدی حاصل کر لیتے ہیں اس میں
راحت و آرام کو خیرباد کہنا ہوتا ہے اور رنج و مصیبت میں مبتلا ہونا ہوتا ہے۔"

۱۱۔ سلسلہ قلندریہ

یہ سلسلہ حضرت نجم الدین مبارک غوث الدہر قلندر غزنویؒ سے منسوب ہے۔ اس سلسلے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے
کہ صرف دو ہی واسطے کے بعد آقائے نامدار سید المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم
کی نسبت آتی ہے۔ حضرت شیخ نجم الدین قلندر غزنویؒ کے پیر و مرشد حضرت میر سید خضر رومیؒ
تھے اور آپ کے پیر و مرشد حضرت شیخ عبد العزیزؒ علمبردار حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔
اور آپ حضرت رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں تھے۔ اس سلسلے میں شریعت و
طریقت کی پابندی کے ساتھ ساتھ حقیقت کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ حجابات کے پردے چاک
ہو جاتے ہیں۔ ذکر و اشغال اور مراقبے سے سلوک کی منزلیں طے کی جاتی ہیں۔ اس سلسلے کی

---

[1] خم خانہ تصوف صفحہ ۲۶۶ مرتبہ ڈاکٹر ظہور الحسن شارب۔

وسعت و شہرت یوپی میں حضرت شیخ نجم الدین غوث الدہر قلندرؒ کے مرید و مجاز حضرت قطب الدین بینائے دل جونپوریؒ سے بہت ہوئی۔ گیارہویں صدی ہجری کے ایک جلیل القدر بزرگ حضرت دیوان محمد رشید جون پوریؒ کو حضرت قطب الدین بینائے دل کے پرپوتے حضرت عبد القدوس قلندرؒ سے اس سلسلے کا فیض نہ صرف یوپی ہی میں محدود رہا بلکہ صوبہ بہار میں بھی مختلف خانوادے میں پہنچا۔ اس سلسلے میں تقویٰ اور طہارت کے علاوہ اذکار و اشغال کی ایسی تعلیم دی جاتی ہے اور اس میں ایسی کشش ہے کہ تمام خانوادے اس سے فیض حاصل کرنا اپنے لئے حصولِ برکت اور تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ حضرت میر فضل اللہ گوسائیںؒ بارہ دری بہار شریف، اس سلسلے کے بافیض بزرگ ہیں۔ ہمارے خاندان میں اسی سلسلے کے ایک گرانقدر بزرگ حضرت حافظ بختیار نا مدار مصریؒ کے واسطے سے اس سلسلے کا فیض پہنچا اور حضرت صوفی منیریؒ کے ماموں حضرت اعظم علی عرف بکین منیریؒ ان کے خلیفہ و مجاز ہوئے۔

۱۲۔ سلسلہ خلوتیہ

یہ سلسلہ حضرت شیخ محمد خلوتی رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے۔ جن کو نجم الدین کبریٰ ولی تراشؒ سے فیض پہنچا ہے اور حضرت نجم الدین کبریٰ ولی تراشؒ کو حضرت عمار یاسر بدلیسیؒ سے فیض پہنچا۔ آپ کی خانقاہ میں بارہ برس تک طریقت و حقیقت حاصل کی ہے اور اس سلسلے کی وسعت اور شہرت حضرت شیخ مظفر لنکانی بیشاپوریؒ سے بہت زیادہ ہوئی لیکن یہ سلسلہ مخصوص حلقے میں محدود ہو کر رہ گیا۔

۱۳۔ سلسلہ اویسیہ

حضرت امام العشاق خواجہ اویس قرنی رضؓ سے منسوب ہے۔ اس سلسلے کی نسبت بڑی تیز ہوتی ہے حالانکہ اس سلسلے میں حضرت خواجہ ابو اسحٰق شہریار گازرونیؒ، عبد اللہ خفیف شیرازیؒ اور حضرت سید جلال الدین حسین مخدوم جہانیاںؒ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ اویسی نسبت ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ سلسلہ عرب و عجم میں تو پھیلا ہی، ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ ہر خانقاہ میں اس کی عظمت و اہمیت ہے۔ اس سلسلے میں والہانہ کیفیت کی تعلیم دی جاتی ہے اور عاشقانہ رنگ رہتا ہے۔

۱۴۔ سلسلہ مغربیہ

یہ سلسلہ حضرت شیخ الکبیر ابومدین شعیب المغربی رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے۔ آپ حضرت محی الدین ابن عربیؒ کے پیر و مرشد ہیں اور شیخ ابو یعزؒ احضرت مسعودؒ کے مرید و خلیفہ ہیں۔ دیارِ مغرب کے مشائخ کبار اور صاحبِ کشف و کرامات بزرگ گزرے ہیں۔ حضرت شیخ غزالیؒ اس سلسلہ کے مشہور بزرگ ہیں اور حضرت شیخ الکبیر کے پیران پیر میں سے ہیں۔ اس سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت احمد گنج کبیر گنج بخشؒ ہیں جن سے اس سلسلے کو کافی فروغ ہوا

۱۵۔ سلسلہ طیفوریہ

یہ سلسلہ حضرت شیخ طیفور بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے۔ آپ بایزید بسطامیؒ کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ آپ کے پیر و مرشد حضرت امام جعفر صادقؒ ہیں۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے نہ صرف اس سلسلے کی ترویج و اشاعت کی بلکہ اس کو اپنی زندگی ہی میں فروغ دیا۔ اس سلسلے کی بنیاد سکر و غلبہ پر ہے یعنی ہمیشہ لوگ نشہ الٰہی میں سرمست رہتے ہیں۔ آپ کی تعلیم ہے کہ عارف وہ ہے کہ جو بجز وصف دیدار الٰہی کسی چیز پر رضامند نہ ہو۔ آپ کا فرمان ہے کہ نیکوں کی صحبت نیک کام کرنے سے بدرجہا بہتر ہے اور بدوں کی صحبت برے کام کرنے سے زیادہ نقصان دہ اور مہلک ہے۔

اس سلسلے کا فیضان ہندوستان میں بھی پہنچا ہے۔ صوبہ بہار کے مشہور روحانی خطہ منیر شریف میں حضرت سید نعمت اللہ قادریؒ فیروز پوریؒ سے حضرت مبارک مصطفےٰ جلال منیریؒ کو پہنچا ہے۔

۱۶۔ سلسلہ خضریہ

یہ حضرت خواجہ ابو العباس خضر علیہ التحیۃ والسلام سے منسوب ہے۔ اس سلسلے میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اور ان کی نسبت حضرت خواجہ ابو العباس خضرؑ سے ہے اور حضرت خواجہ ابو العباس خضر کو حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم سے ہے

۱۷۔ سلسلہ رفاعیہ

یہ سلسلہ حضرت شیخ احمد کبیر رفاعیؒ سے منسوب ہے۔ جو حضرت شیخ ابو الفضل بن کاتبؒ کے مرید ہیں۔ بارہ طون

کے بعد حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ کا نام آتا ہے۔

اس سلسلہ میں جذب و مستی بہت زیادہ ہے۔ سماع کا شغف زیادہ ہے اور وجد کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ سلبِ امراض کا بھی جوہر ہے۔ عوام سے کنارہ کشی اختیار کر کے جنگل و صحرا میں رہتے ہیں اور حیوانات و درندے اس سلسلے کے بزرگوں سے مانوس۔ طرح طرح کے خرقِ عادات بھی ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ کا فروغ حجاز و شام میں زیادہ ہوا۔

۱۸۔ سلسلہ طاؤسیہ

یہ سلسلہ حضرت شیخ ابوالخیر اقبال الملقب بن رسول الثقلین بطاؤس الحرمینؒ سے منسوب ہے۔ آپ حضرت شیخ ابوالحسن اسیر واقیؒ کے مرید ہیں جو سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کے مرید و مجاز ہیں۔

۱۹۔ سلسلہ منعیمہ المشہور بالمہیمنیہ

یہ سلسلہ حضرت شیخ ابوالفضائل بن عبدالمنعم سے منسوب ہے۔ آپ کے پیر و مرشد حضرت شیخ ابوالفتحؒ ہیں جو حضرت شیخ ابوسعید بن ابی الخیرؒ کے مرید و مجاز ہیں۔ اس سلسلہ کے مشہور بزرگ شیخ ابونصر سراجؒ ہیں جو حضرت جنید بغدادیؒ کے مرید شیخ محمد مرتعشؒ کے مرید و مجاز ہیں۔

ہمارے خاندان کے قلمی سفینوں میں صرف یہی ۱۹ سلاسل مذکور ہیں۔ بعض سفینوں کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ سلسلے ہیں لیکن یہ مرکزی حیثیت کے حامل نہیں بلکہ شاخ در شاخ ہیں اور نہ جانے سلسلہ چشتیہ، سلسلہ قادریہ، سلسلہ نقشبندیہ، سلسلہ فردوسیہ سلسلہ قلندریہ، سلسلہ زاہدیہ کی کتنی شاخیں پیدا ہو سکتی ہیں لیکن ہمارے یہاں ان کو نسبتیں یا واسطے کہتے ہیں جو عظیم شخصیتوں سے وابستہ ہیں۔ ان علمی سلسلوں میں کچھ تو ایسے ہیں جن کی صرف تاریخی حیثیت قائم ہے اور کچھ ایسے ہیں کہ پرانی خانقاہوں میں کبھی کبھی کوئی معتقد اس سلسلے میں داخلِ سلسلہ ہو جاتا ہے اور بعض سلسلے ایسے ہیں کہ کسی زمانے میں اس کی بڑی عظمت و شہرت تھی لیکن اب اس کی اتنی وسعت نہیں صرف خاندانی اعتبار سے اس کی ترویج ہو رہی ہے لیکن بعض سلسلے ایسے ہیں جن کی ہر زمانے اور ہر دور میں شہرت و مقبولیت رہی ہے اور ابھی تک رشد و ہدایت کے فریضے انجام دے رہے ہیں۔ ان میں سلاسل قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، فردوسیہ، ابوالعلائیہ،

شطاریہ، زاہدیہ، قلندریہ، سہروردیہ قابلِ ذکر ہیں۔ سلسلہ شطاریہ کو عہد جہانگیری میں بہت مقبولیت رہی۔ سلسلہ زاہدیہ سلاطین شرقیہ کے عہد میں شہرت کا حامل رہا۔ اگرچہ آج بھی یوپی اور بہار میں ضلع سارن میں اس کی مقبولیت ہے۔ سلسلہ ابو العلائیہ کی مقبولیت بارہویں صدی ہجری میں رہی اور ان کی خانقاہیں فیوض و برکات کی حامل ہیں۔ غرض کہ یہ تمام سلسلے آج بھی قدیم خانقاہوں میں محفوظ ہیں اور ان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ تمام سلسلے نہ صرف رشد و ہدایت کے اہم فریضہ انجام دیتے ہیں بلکہ اسی سے محبت، اخوت، انسان دوستی، اخلاق کی بلندی، عاجزی و انکساری، ایثار و قربانی کے جذبے پیدا ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ان تمام سلاسل کے فیوض جاری و ساری ہیں اور آج بھی ان سلاسل کی تعلیمات بزرگوں کے آستانے اور ان کی خانقاہوں میں دی جاتی ہیں جو خدمتِ خلق اور انسان دوستی کے لئے کافی اہم ہیں اور اسی سے انسانیت، اخوت کو فروغ اور ہدایت کا قیام ہے۔

قرونِ اولیٰ میں دنیاوی معاملے ہوں یا دینی امور کاموں کا فیصلہ اور تعلیم و تربیت مسجدوں ہی میں انجام پاتے تھے لیکن پہلی صدی ہجری کے اختتام پر جب خلفاء یعنی سلاطین کی دل جوئی اور اطاعت گذاری تمام علمائے عظام کا شعار بن گئی تو مسلمانوں کا ایک طبقہ عرفان الٰہی، محبت، اخلاص کے لئے صوفیائے کرام کی صحبت اور علم طریقت و معرفت کا جویا ہوا۔ اس لئے کہ ان ہی کی وہ ذات مقدس تھی جو سیاست سے کنارہ کش ہو کر یاد الٰہی اور خدمتِ خلق میں مشغول تھی۔ ان کی روحانی تربیت کے لئے ایک ایسے مقام کی ضرورت پیش آئی جہاں وہ حق کی تلاش اور طالبانِ علم معرفت کی تعلیم و تربیت کر سکیں۔ یہی مقام خانقاہ کے نام سے تعبیر ہے۔ اور خانقاہ دراصل اسی ضرورت کا نتیجہ ہے۔ تمام سلاسل کی ترویج و اشاعت کی تعلیم اسی خانقاہ میں دی جاتی رہی ——— ہندوستان میں صوفیوں کے دورِ اولیٰ کی خانقاہیں تعلیم و تربیت کی عظیم ذہنی اور روحانی یونیورسٹیاں تھیں۔ یہ عظیم ادارے اسلام کی تبلیغ کے مراکز تھے اور وہاں زبان و ادب کی نشو و نما ہو رہی تھی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ان تمام سلاسل تصوف کی تعلیمات اور فیضان عملی شکل میں ہو یا علمی شکل میں دنیا کی تمام قدیم اور عظیم خانقاہوں میں جاری و ساری ہیں۔ ذکر و اشغال۔ مراقبہ و محاسبہ، تزکیہ نفس، تصفیہ قلب، منازل سلوک غرضکہ یہ تمام صوفیت کی ترویج کی مختلف شکلیں ہیں۔

صوفیت مذہب و اخلاق کی لطیف شکل ہے اور اس میں خارجی مراسم سے زیادہ کیفیتِ دل اور عرفانِ حق پر زور دیا جاتا ہے تمام عالمی ادب کی روایات میں بھی اخلاقی اور عرفانی عناصر موجود ہیں۔ شاعری کے علاوہ نثر میں بھی ہمیں اخلاقی اور روحانی تجربہ اور پیام کی روشنی ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی اور مغربی ادب میں بھی صوفیانہ میلانات ملتے ہیں۔ تصوف اور اس کے تدریجی ارتقا اور میلانات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کے تمام حقائق روشن ہو جائیں گے میں نے اپنے تحقیقی مقالہ میں اس پر روشنی ڈالی ہے :-

"تصوف ایک علم بھی ہے اور ایک فن بھی۔ فن تجربات حیات، احساسات جذبات اور واردات، تخیلات افکار و معانی اور تصورات کو متوازن تراشیدہ، بالیدہ، اور منظم، حسین اور پُر تاثیر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ تجربات کی نوعیت خواہ کچھ ہو، مجاز ہو یا حقیقت انہیں جذبی اور تخیلی طور پر باندازۂ توازن و تناسب پیش کرنا فنکاری ہے۔ لہٰذا شعر و ادب کی دنیا میں مناظرِ فطرت کی جگہ بھی ہے اور حقائق معاشرہ کی بھی، جذبات و کوائف داخلی کی بھی اور افکار و خیالات و عقائد کی بھی پھر کسی ایک جذبے کو لیجئے مثلاً "جذبۂ عشق" اس کے بھی ہزار شیوے ہیں ؎
"بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست" [1]

تصوف کی جلوہ گری کسی نہ کسی رنگ میں ہر مذہب و ملت میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتی ہے۔ اردو کی ترقی میں اس نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ فارسی ادب و شاعری کا بہت بڑا ذخیرہ صوفیائے کرام ہی کا مرہونِ منت ہے اسی طرح اردو ادب و شاعری بھی ان کے فیض سے محروم نہ رہی۔ چنانچہ ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے اس پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ :-

---

[1] حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے ص ۱۸۷

"مذہبی نقطۂ نگاہ سے ہماری شاعری میں ہر عقیدے سے زیادہ مواد صوفیانہ شاعری کا ہے لیکن طرزِ تخیل وطرزِ بیان پر اگر غور کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ فارسی شاعری کی جھلک ہے۔ جس والہانہ انداز سے فارسی شعراء نے تصوف پر طبع آزمائی کی ہے اسی کی تقلید اردو والوں نے بھی کی ہے۔ اس وقت اس سے بحث نہیں وہ فارسی شعراء کے برابر پہنچ سکے ہیں یا نہیں لیکن یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ خیالات و جذبات میں یکسانیت ہے اطرزِ بیان بھی بہت کچھ فارسی سے متاثر ہو چکا ہے اس اختلاط پر کوئی تعجب نہیں ہوتا اس لئے کہ اول تو مذہبی عقائد میں ہر صوفی یکساں تھا اور دوسرے یہ کہ فارسی زبان میں اتنے بلند پایہ صوفی اور شاعر پیدا ہو چکے تھے کہ ان کے کلام اور شخصیت سے ایک عالم متاثر تھا۔ شمس تبریز، جلال الدین رومیؒ، عطارؒ، حافظؒ، سعدیؒ وغیرہ بحیثیت صوفی و نیز بحیثیت شاعر اپنا مرتبہ دنیا میں مستقل قائم کر چکے تھے۔ اور اگر یہ بھی سوچ لیجئے کہ فارسی زبان کی نرمی و پختگی کس قدر حسین اور لطیف ہے تو پھر زیادہ غور کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہتی کہ کیوں اردو والوں نے فارسی شعراء سے فیض اٹھایا۔" لہ

اردو کی ابتدائی نشو ونما اور صوفیائے کرام کی خدمات

اردو کی ابتدائی نشو ونما کا جہاں تک تعلق ہے یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ اس کی آبیاری میں صوفیائے کرام کا بڑا ہاتھ ہے اور اردو کے نقوشِ اولین ان ہی صوفیائے کرام کے مرہونِ منت ہیں۔ دیارِ ہند میں صوفیائے کرام رشد و ہدایت، تزکیۂ روحانی، خلوص و محبت اور اخلاق و ایثار کے ذریعے عوام کے دلوں پر فتح حاصل کر رہے تھے۔ وہ عوام کو وعظ و نصیحت بھی کرتے۔ ان کے پند و نصائح میں صداقت اور کشش ہوتی جو عوام کے دلوں پر نقش کر جاتے اور لوگوں کے دلوں کو گھر کر لیتے اور وہ گرویدہ ہو کر ان کے دامن سے وابستہ ہو جاتے۔ اسی طرح ان کے طور طریقے

لہ مذہب و شاعری، مصنفہ ڈاکٹر اعجاز حسین صفحہ ۸۵-۸۶

اور زبان پر بھی اثر پڑتا ہے یہی اسباب اردو کی ابتدائی نشو و نما کے لئے سازگار ہوئے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنی تصنیف میں اس طرح روشنی ڈالی ہے :۔

"جس وقت اردو کی تخلیق ہو رہی تھی۔ ملک میں مذہبی فضا ہر شعبۂ زندگی پر حاوی تھی۔ سلطنت چاہے کسی کی رہی ہو مگر مذہب شہنشاہی کر رہا تھا۔ ہر طبقہ اس کے آگے سر جھکائے تھا۔ اس کی آنکھ سے دنیا کی ہر چیز دیکھی جا رہی تھی اسلام مغرب اور مشرق کے اکثر گوشے چھان کر ہندستان میں اپنا جھنڈا گاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مسلمان بادشاہوں نے تبلیغ اسلام کے لئے منظم انجمن یہاں قائم نہیں کی۔ فقراء اور علماء نے البتہ اشاعتِ اسلام میں کافی حصہ لیا۔ جہاں کہیں وہ پہنچے مذہب کی ترویج دل کھول کر کی اور اسی سلسلے میں اردو کو بھی آگے بڑھنے کا موقع ہاتھ آتا رہا۔ چنانچہ شمال یا جنوب جہاں بھی اردو کی قدیم تصنیف یا تالیف دستیاب ہوتی ہے وہ مذہب ہی کی آورد معلوم ہوتی ہے"۔[1]

دوسری وجہ اردو کی نشو و نما کی یہ بھی ہے کہ صوفیائے کرام کی غرض و غایت رشد و ہدایت و تبلیغِ اسلام تھی اس لئے ان کا تعلق خواص سے زیادہ عوام سے تھا۔ عوام تک رسائی کے لئے خدمتِ خلق کے ساتھ ساتھ ان کی زبان کا بھی جاننا ضروری تھا کیونکہ وہ عوام ہی کی زبان میں تبلیغِ اسلام کرتے اور ان کی زبان کو اپناتے اس طرح عوام کی زبان کے الفاظ، جملے اور فقرے کی شکل میں زبانِ فیض ترجمان سے صادر ہوتے اور یہی بھاشا اور ان کی زبان داخلا ماتحا کہ عوام زیادہ سے زیادہ ان کے ارشادات کو سمجھ سکیں اور ان کے فیوض و برکات سے فیضیاب ہو سکیں۔ اس لئے صوفیائے کرام نے مقامی بھاشا کو گلے لگایا اور یہی بھاشا آگے چل کر اردو کی شکل میں جلوہ گر ہوئی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو ادب میں ہمیں صوفیت کی روایت ان بزرگانِ دین کے تربیتی فقرے اور اخلاقی دوہے وغیرہ میں ملتی ہے جو بھاشاؤں کے لباس میں ملفوظ ہے۔

---

[1] مذہب و شاعری ڈاکٹر اعجاز حسین ص ۲۳

اور انہیں اردو کے نقوشِ اولین کہا جاتا ہے۔ یہ فقرے زبان کی ارتقا میں معاون ضرور ہوئے ہیں اور ان ہی میں کچھ صوفیانہ اور اخلاقی نکتے بھی مل جاتے ہیں۔ مثلاً حضرت بابا فریخ گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ (۵۸۰ھ تا ۶۶۴ھ) کا یہ فقرہ قابلِ توجہ ہے کہ آپ کے مشہور مرید و خلیفہ حضرت جمال الدین ہانسوی تھے جن کی کنیز مادرِ مومناں کے نام سے مشہور تھیں۔ جب قطب جمال ہانسوی کا انتقال ہو گیا تو آپ کے چھوٹے صاحبزادے مولانا حضرت برہان الدین صوفی کو مع مصلیٰ و عصا حضرت بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں لے گئیں۔ آپ نے حضرت برہان الدین صوفی کو بیعت سے مشرف کر کے اسی مصلیٰ اور عصا کے ساتھ خلافت نامہ بھی عطا فرمایا اور آپ کو واپس کر دیا اس وقت حضرت نظام الدین اولیاؒ بھی موجود تھے۔ مادرِ مومناں نے یہ دیکھ کر حضرت فریدالدین گنج شکرؒ سے یہ عرض کیا کہ "خوجا بالا ست" آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ "مادرِ مومناں پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے" مراد یہ کہ بالا وہ ہے جو روحانی طور پر تاباں ہے جیسے پونم کا چاند ہوتا ہے۔ [1]

شمالی ہند میں صوبہ بہار کی بھی خاص اہمیت ہے۔ یہاں کے صوفیائے کرام نے بھی اردو زبان و ادب کی آبیاری میں ابتدا ہی سے حصہ لیا ہے۔ چنانچہ صوبہ بہار کے عظیم المرتبت صوفی بزرگ حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مقولے، دوہرے، کنج منڈے، فالنامے وغیرہ مشہور ہیں۔ اور اس میں تصوف کے نکات بھی ہیں۔ آپ کے ملفوظ معدن المعانی میں وہ جوابی فقرہ[2] "دیس بھلا پر دور" ایک مرید کے مقولے "باٹ بھلی پر سانکری" کا جواب تھا۔ یہ فقرہ اس طرح ہے "باٹ بھلی پر سانکرا دیس بھلا پر دور" یعنی راستہ (راہِ سلوک) تو اچھا ہے لیکن تنگ (دشوار گزار ہے)۔ دوسرے فقرے کا مفہوم یہ ہے کہ دیس (منزلِ مقصود) بہتر تو ہے لیکن بہت دور ہے۔ اس کے علاوہ فالنامے مخدوم جہاں مخطوطہ ۱۰۹۶ھ میں بھی تصوف کے نکات ملتے ہیں۔ آپ کے مرید و جانشین حضرت مولانا مظفر بلخیؒ (متوفی ۸۰۳ھ) کے مکاتیب میں بھی مختلف دوہے ملتے ہیں۔ آپ کے دوہے

---

[1] سیر الاولیاء، سید مبارک بعروف امیر خورد ص ۱۸۲-۱۸۳ [2] معدن المعانی حضرت شرف الدین یحییٰ منیری ص ۴۰۳

کے نمونے درج ذیل ہیں :-

باٹ بھلی پر سانگری نگر بھلا پر دور بانہہ بھلا پر پاتلا ناری کر ہر چور
سانکر کوئی پتال پانی لاکھ بوند لگائے بجر پرو تیہ تہہ نگری کا تیہ پیا سا جائے

حضرت مخدوم جہاں کے خالہ زاد بھائی حضرت مخدوم احمد چرم پوشؒ متوفی ۷۷۶ھ سلسلہ سہروردیہ کے مشہور بزرگ ہیں۔ آپ فارسی کے صوفی شاعر بھی تھے۔ آپ کا ایک ہندی دوہہ ضیاء القلوب میں موجود ہے۔ آپ زاہد و پارسا کا فرق بتاتے ہوئے فرماتے ہیں :-

میتا من نو یہ شروتی کہا ہوئے انہیں بیدھا بیدماں سر نہ کیتی کوئے[۱]

مونس القلوب از حضرت احمد لنگر دریا بلخی (۸۲۶ھ تا ۸۹۱ھ) میں ہے کہ جس رات حضرت مخدوم جہاں قدس اللہ سرہٗ نے انتقال فرمایا اسی رات مولانا مظفر بلخیؒ نے عدن میں خواب دیکھا کہ حضرت مخدوم جہاںؒ یہ دوہا پڑھ رہے ہیں :-

آئیں رات سہائیاں جن کارن دھکا کھائیاں[۲]

یعنی وہ سہانی رات آگئی جس کے لئے میں نے اتنے دھکے کھائے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ (۷۰۷ھ تا ۷۸۵ھ) آپ حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے حضرت رکن الدینؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ آپ کا ایک ہندی مقولہ حضرت قاضی علا شطاریؒ متوفی ۹۰۰ھ کے ملفوظ معدن الاسرار میں درج ہے۔ اس میں ایک واقعہ ہے کہ کسی نے مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ جو اوراد و اعمال ہیں جو وہ بھی پڑھتا ہے اور کرتا ہے جو خود حضرت مخدوم جہانیاں بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس پر حضرت مخدوم جہانیاں نے جواب دیا "کھندا ہے پھند اکہاں"۔ اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ گڈھا تو ہے اور اس میں مچھلیاں بھی ہیں لیکن جال نہیں ہے۔ یعنی تزکیۂ نفس اور جذب صادق وصول الی اللہ کے لئے ضروری ہے۔

بزرگوں کے اس قسم کے بہت سے اقوال جو ہندی دوہوں اور صاف کھڑی بولی کے فقروں پر مشتمل ہیں، ان کے ملافیظ و مکاتیب میں موجود ہیں۔ جیسے لطائف اشرفی ملفوظ حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ میں۔ حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے مکاتیب میں متعدد ہندی فقرے ہیں اور ان

---

[۱] ضیاء القلوب، ملفوظ حضرت سید احمد چرم پوش۔ [۲] مونس القلوب مجلس ہشتم ص ۷۹۔

کی کتاب مرشد نامہ میں تو ایسے جنبہ کا راگوں کی طرز پر ان کی زبان مبارک سے متعدد فقرے ادا ہوئے ہیں۔ یہ سب چیزیں یا ہندستان کی ایک مشترک زبان کی نشو و نما کی نشاندہی کر رہی ہیں اور یہ دلیل قطعی اس بات کی ہے کہ تبلیغ و اشاعت اور باہمی میل جول کی فضا تیار کرنے کے لئے ان بزرگوں نے بہت اہم کردار کا ثبوت پیش کیا ہے۔ لیکن یہ فقرے منتشر اور غیر مربوط ہیں۔ بعض بزرگوں نے تو چھوٹے چھوٹے رسالے نظم و نثر میں لکھ ڈالے تاکہ دین کی ضروری باتیں اور تصوف کے نکات عوام کے ذہن نشین ہو جائیں۔ بعض صوفیوں نے مذہبی رسالے لکھے ہیں۔ جن میں یا تو اسلامی صوفیانہ تربیت کے نکتے ملتے ہیں یا اسلامی عقائد پیش کئے گئے ہیں۔ یہ رسالے مربوط نثر میں ہیں۔

حکیم شمس اللہ قادری نے اپنی تصنیف میں شیخ عین الدین گنج العلم (متوفی ۷۹۵ھ) کے رسالہ کو تو اردو نثر کا سب سے پہلا کارنامہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور ان ہی کی ہمنوائی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے بھی کی ہے[۱]۔ لیکن حامد حسن قادری نے اپنی تصنیف میں اردو نثر کی پہلی تصنیف حضرت مخدوم سید اشرف سمنانی (۷۰۸ھ تا ۸۰۸ھ) کے ایک اردو رسالہ کو قرار دیا ہے جو ۷۵۸ھ میں تصوف اور اخلاق پر لکھا گیا ہے جدید تحقیق کی بنیاد پر حضرت اشرف جہانگیر سمنانی کے رسالہ جنونیہ کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ رسالہ بیجاپور کے سرکاری عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنی تحقیق کے سلسلے میں اس کا انکشاف کیا۔ اس رسالہ میں اردو مقولوں کی تشریح فارسی میں کی گئی ہے۔ جیسے "بات کی بات کرافات کرافات است" یعنی جائے سخن سخن است و جائے خرافات کرافات است "چناں باشد یعنی نزدیک عارفاں ہر سخن کہ از عوام الناس ظاہر می شود خواہ نیک باشد خواہ بد ایشاں ہمہ راست می شوند"۔ ایک جگہ وہ فرماتے ہیں "وہاں بسائی تین کمہار، دو لولے ایک کوں ہاتھ نہیں" معنی ظاہر است کہ آنجا آباد کردن سہ کلال دو از دست لنج بودند و یکے دست نداشت مراد از سہ کلال آباداں کردن آنست یعنی سہ کس را بظہور آوردند۔ یکے طالب دنیا دوم طالب عقبیٰ سوم طالب مولیٰ دو از دست لنج بودند یعنی طالب دنیا و طالب عقبیٰ ازاں جہت کہ دست

---

[۱] اردو شہ پارے حصہ اول صفحہ ۱۹ مصنفہ محی الدین قادری زورؔ۔

در طلب مولیٰ دراز نہ کردند[1]

اس رسالہ جنونیہ کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ ۹۵۰ھ میں تصنیف ہوا ہے اور یہ اخلاق وتصوف کے نکات ورموز پر مشتمل ہے ۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رح کے چھوٹے بھائی حضرت سید صدر الدین راجو قتال رح کے بھی ایک رسالہ کا پتہ چلتا ہے جو رسالہ حضرت شاہ راجو کے نام سے منسوب ہے۔ اس میں بھی عقائد اور تصوف کے نکات درج ہیں اس کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ہیں جو صوفیائے کرام کے نام سے منسوب ہیں۔ شمالی ہندستان کے علاوہ جنوبی ہندستان خصوصیت کے ساتھ دکن اور گجرات بھی اردو کے بڑے مرکز سمجھے جاتے ہیں اور یہاں بھی صوفیائے کرام کی بدولت یہ نئی زبان پھولی پھلی اور پروان چڑھی۔ جب محمد تغلق نے دیوگیری کو دولت آباد بنا کر اپنا دارالسلطنت قرار دیا اور علماء، صوفیاء اور ادباء اور شعراء کو دلی سے دیوگیری منتقل ہونے پر مجبور کیا تو نئی مشترک زبان بھی ان کے ساتھ ساتھ دکن میں داخل ہوئی اور سلاطین بیجاپور اور گولکنڈہ نے اپنے عہد میں ان کی ترقی واشاعت میں اہم کارنامے انجام دیئے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان بزرگانِ دین کے فیوض کے بغیر وہ مشترکہ زبان جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی میل جول اور بول چال کا نتیجہ تھی پروان نہیں چڑھ سکتی تھی۔ چنانچہ دکن میں باقاعدہ طور پر صوفیانہ رنگ کی تصنیفیں شروع ہوئیں جو پہلے فارسی میں ہوا کرتی تھیں ۔

حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو دراز رح (۷۲۱ھ تا ۸۲۵ھ) مرید وجانشین حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی رح نے رشد وہدایت کے لئے فارسی میں مختلف عربی رسائل کے ترجمے کئے۔ اس کے علاوہ تصوف میں بھی بعض رسالے دکنی اردو میں تصنیف فرمائے جن میں معراج العاشقین بہت مشہور ہے جو تصوف کے نکات اور اصطلاحات کی توضیح وتشریح پر مشتمل ہے اس رسالہ میں وہ تمام اصول وضوابط بتائے ہیں جن پر عمل کرنے سے سالک مقامِ ذات تک پہنچ جاتا ہے[2] یہ رسالہ بتیس صفحات کا ایک مختصر رسالہ ہے جو ۸۰۰ھ تا ۸۲۵ھ میں تصنیف ہوا اس میں دکنی

---

[1] اردو نثر کا آغاز وارتقاء مصنفہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صـ ۵۲ بحوالہ حضرت صوفی منیری رح کے نثری کارنامے صفحہ ۸۹-۸۸ ۔ [2] معراج العاشقین صـ ۲۵ مرتبہ خلیق انجم ۔

زبان کا زیادہ اثر ہے اور چونکہ اردو کے بالکل ابتدائی دور میں لکھا گیا ہے اس لئے اس میں بہت کچھ خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے دو اور چھوٹے چھوٹے رسالوں کے ذریعہ عوام کو رشد و ہدایت کی تعلیم دی ہے اس کا سلسلہ ان کے بعد بھی قائم رہا۔ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے اکبر حسینی (۷۴۳ھ تا ۸۲۳ھ) نے نشاط العشق تصنیفِ حضرت عبدالقادر جیلانی کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ شاہ دارا نے بھی چودہ اوراق کا ایک رسالہ کثیف الوجود لکھا جس کا موضوع تصوف ہے۔ بہاؤالدین باجن (۸۵۵ھ تا ۹۵۲ھ) نے بھی اپنے مرشد کے ملفوظات اور ارشادات جمع کئے ہیں جس کا نام خزانہ رحمت رکھا۔ شاہ قلندر جو شاہ ید اللہ حسینیؒ کے مرید تھے، انہوں نے رسالہ شاہ قلندرؒ کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس کی عبارت مسجع و مقفیٰ ہے۔ لیکن اس کے ابتدائی نمونے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ملا وجہی کے پیش نظر اس تصنیف کے نمونے ہوں گے۔ مذکورہ بالا حقائق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان صوفیائے کرام نے رشد و ہدایت کیلئے تصوف کے رموز و اسرار کی وضاحت کو اردو زبان میں زیادہ موزوں اور مناسب سمجھا اور اسی پر اپنی تصنیف و تالیف کی عمارت کھڑی کی۔ یہ وہ ذوق و شوق تھا جو بڑھتا ہی گیا۔ آٹھویں صدی کے بعد نویں صدی ہجری میں بھی صوفیائے کرام اس خدمت پر مامور نظر آتے ہیں۔ عادل شاہی حکمرانوں نے بھی تقریباً دو سو برسوں تک اس کی آبیاری کی اور علم و ادب کی سرپرستی کی دو سو سال میں بیجاپور میں اردو کے کئی مشہور شاعر اور مصنف گزرے ہیں۔ جن میں شمس العشاق میراں جی، برہان الدین جانم اور شاہ امین الدین اعلیٰ مشہور و معروف ہیں۔ شاہ میراں جی متوفی ۹۵۲ھ کی نثر میں کئی تصانیف ہیں۔ جن میں شرح مرغوب القلوب"، "گلباس"، "جل ترنگ" بیانِ تصوف میں مشہور ہیں۔ وجیہ الدین علوی گجراتی (۹۱۱ھ تا ۹۹۸ھ) کی تصنیف تاج الحقائق اور بحر الرائق مشہور ہیں۔ شاہ علی محمد جیو گام دھنی کی تصنیف بھی پائی جاتی ہے۔ دسویں صدی ہجری میں شاہ برہان الدین جانم نے تصوف و سلوک میں متعدد رسائل تالیف کئے جن میں توحید و تصوف کے مسائل ہیں۔ معرفت القلوب ان کی مشہور تصنیف ہے جن میں سادگی کے ساتھ ساتھ شاعرانہ لطافت بھی ہے۔ شاہ امین الدین اعلیٰ کی تصانیف گنج مخفی، نکاتِ معرفت اور گفتار شاہ امین مشہور ہیں جن میں تصوف کے بعض مسائل اور بعض اصطلاحات کی تشریح کی

گئی ہے ۱؎۔ حضرت امین الدین اعلیٰؒ کے خلفا نے بھی اس سلسلے کو جاری رکھا چنانچہ ان میں مولانا عبداللہ نے احکام الصلاۃ، میراں جی خدا نما نے شرح تمہید، شاہ میراں حسینی نے خلاصۃ الرویا، میراں یعقوب نے شمائل الاتقیا، برہان الدین قادری نے رسالہ وجودیہ، حبیب اللہ قادری نے تحفۃ الرسد اور ولی اللہ قادری نے معرفۃ السلوک لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مشہور صوفیانہ تصانیف کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

اس عہد میں صوبہ بہار میں عماد الدین قلندر پھلواریؒ ۱۱۰۱ھ سے ایک مذہبی رسالہ منسوب کیا جاتا ہے جس کا نام سید ھا راستہ یا صراطِ مستقیم ہے۔ ظہور الحق ظہورؔ نے بھی مختلف رسائل تصنیف کئے ہیں جن میں فیضِ عام اور کسب النبی کی اہمیت ہے اس کے علاوہ بھی علمائے صادق پور نے مذہبی رسالوں کے ذریعہ رشد وہدایت کی ترویج واشاعت کی۔ حضرت پیر دمڑیاؒ اور ان کے سجادگان وخلفاء نے بھی اردو میں چھوٹے چھوٹے رسالے تصنیف کئے جن کے ذریعہ اخلاق وتصوف کی تعلیم دی گئی ہے۔ حضرت تقی بلخیؒ نے بھی مذہبی رسالہ الاحکام لکھا۔ یہاں بھی یہ رجحان ترقی پذیر رہا اور اردو نثر میں مختلف کتابیں تصوف اور تذکرہ مشائخ میں لکھی گئیں۔ شمالی ہند میں بھی فضل کی کربل کتھا یا دہ مجلس کو اہمیت حاصل رہی ان کے علاوہ بھی اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ مختصر یہ کہ اس دور کی نثری تصانیف مذہبی اور صوفیانہ ہیں۔ کیوں کہ ان کے لکھنے والے علماء تھے یا صوفیاء۔ انہوں نے مذہب کے خشک مسئلوں اور ٹھوس اصولوں کو بھی ادبی رنگینیاں بخشیں اور ان صوفیانہ خیالات کے ذریعہ ہندستانی عوام کی ذہنی اور باطنی اصلاح کی ہر ممکن کوشش کی اور اس کے ذریعہ تزکیۂ نفس کا کام کیا۔ ان بزرگوں نے اپنی تحریروں میں فنی اور جمالیاتی قدروں سے زیادہ اخلاقی، اصلاحی اور صوفیانہ قدروں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

تمثیل نگاری

تمثیل نگاری نے ادب میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا ہے کیوں کہ بعض حقیقتیں صاف صاف بیان کرنے سے وہ اثر نہیں رکھتیں جو

۱؎ قدیم اردو مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق ص ۵۶ ۔

تمثیل کے پیرائے میں اثر پذیر ہوتی ہیں۔ انسان اس سے متاثر بھی ہوتا ہے اور کیف آگیں بھی تصوف کے بعض نکات ایسے بھی ہوتے ہیں جو صاف صاف بیان نہیں کئے جا سکتے ان کو کنایوں اور اشاروں میں بیان کیا جاتا ہے۔ تمثیل اس کے لئے بہت زیادہ کار آمد ہے۔ چنانچہ اردو میں بندہ نواز گیسو دراز کا رسالہ شکار نامہ تمثیلی پیرایہ میں ہے اور دوسرا رسالہ تمثیل نامہ بھی ہے۔ اس میں تمثیل کے ذریعہ خدا کی حقیقت سمجھائی گئی ہے ؎ حضرت میراں جی شمس العشاق کے رسالے خلیۃ تنگ اور رگلباس بھی تمثیلی انداز میں ہیں۔ ان رسالوں میں مصنف نے تصوف کے اسرار و نکات تمثیل کے پیرائے میں بیان کئے ہیں۔

گیارہویں صدی ہجری میں اردو کی پہلی مکمل تمثیل وجہی کی سب رس ہے جو فتاحی نیشاپوری کی نثری تلخیص قصۂ حسن و دل سے ماخوذ ہے۔ اس میں تصوف کے مراحل اور عشق کے واردات کو تمثیل کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے کردار مجرد صفات ہیں۔ بظاہر یہ ایک دلچسپ داستان ہے لیکن حقیقت میں تصوف کے رازہائے سربستہ کو دلکش انداز میں ظاہر کیا گیا ہے۔ وجہی نے جس اسلوب کو پروان چڑھایا وہ ان کے بعد بھی قائم رہا اور بتدریج داستان، قصے اور نظموں میں تمثیل کا استعمال ہوتا رہا۔ سب رس کے بعد اس رنگ کی دوسری تصنیف رجب علی بیگ سرور کی گلزار سرور ہے جو ملا محمد رضی تبریزی کی فارسی نثر حدائق العشاق کا ترجمہ ہے۔ گلزار سرور کے بعد تمثیلی کہانی میں طلسم حیرت کا نام قابلِ توجہ ہے جسے جعفر علی خاں شیون نے ۱۲۰۰ھ میں ترتیب دیا۔ بوستانِ خیال بھی ایک تمثیلی رنگ میں ہے۔ آخر میں یہ کہوں گا کہ راحت روح مصنفہ حضرت صوفی منیری بھی تمثیل نگاری کی شاہکار ہے

اُردو میں صوفیانہ شاعری

اردو ادب میں صوفیت کی دوسری روایت شاعری میں ملتی ہے۔ اس میں بعض ایسے شاعر ہیں جو خود صاحبِ تجربہ صوفی گزرے ہیں یعنی جو باالعمل اور باالذات بھی صوفی تھے۔ ان کا مسلک

؎ اردوئے قدیم صفحہ ۱۱۶ مصنفہ شمس اللہ قادری۔

و مشرب صوفیانہ تھا اور اسی فضا میں سانس لے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے تجربات اخلاقی، روحانی اور عرفانی کو شعریت بخشی اسی لئے ان کے اشعار میں ان کے صوفیانہ خیالات کی جلوہ گری ہے اور بعض ایسے بھی شعراء تھے جو صوفی تو نہ تھے مگر علمی اور فنی طور پر صوفیانہ موضوعات و نکات پر اشعار نظم بند کرتے تھے۔ وہ شعراء جو باقاعدہ صوفی تھے ان میں سب سے پہلے حضرت بابا فرید گنج شکر کا نام لیا جاتا ہے اس لئے کہ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی تصنیف اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام میں ایک غزل ان سے منسوب کر کے نقل کیا ہے وہ یہ ہے۔

وقت سحر وقت مناجات ہے — خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا — خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
باتن تنہا کرو مے زیر خاک — نیک عمل کن کی وہی سات ہے
پند شکر گنج بہ دل و جاں شنو — ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

حضرت بوعلی شاہ قلندر پانی پتی کے نام سے ایک دوہا بہت مشہور ہے ۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کر و کہ بھور کبھو نہ ہوئے

حضرت امیر خسرو دہلوی (۶۵۳ھ تا ۷۲۵ھ) آپ حضرت نظام الدین اولیاء کے چہیتے مریدوں میں تھے آپ نے ہندی میں دوہے اور غزلیں کہی ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان کا ہندوی کلام ابھی تک ثقہ طور پر تحقیق کی روشنی میں نہیں آسکا ہے۔ آپ کے فارسی دیوان غرۃ الکمال کے دیباچہ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ہندی میں بھی بہت کچھ کہا ہے[1]۔ ایک مشہور غزل فارسی اور ریختہ کی ہے جس کے ہر شعر کا پہلا مصرع فارسی تو دوسرا مصرع ریختہ میں ہے۔ آپ کی طرف منسوب ہے اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں ۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

---

[1] دیباچہ غرۃ الکمال صـ ۲۶ ۔

شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

حضرت امیر خسروؒ کے تین دوہے بھی پیش خدمت ہیں :- ؎

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس   چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چودیس

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ   تن میرا من پیو کا دو بھئی ایک رنگ

وہ گئے بالم وہ گئے ندیا کنار   آپے پار اتر گئے ہم تو رہے اروار

حضرت امیر خسرو چوں کہ صوفی مشرب ادیب و شاعر تھے اس لیے ان کے ادب و شعر میں تصوف کی عکاسی ہے۔ وہ فارسی شعر و ادب کے تو عظیم المرتبت صوفی شاعر ہیں البتہ ریختہ یا اردو میں ان کے شہ پارے خاطر خواہ دستیاب نہ ہو سکے ہیں اس لیے ان کے متعلق کوئی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی لیکن یہ بات قرین قیاس ہے کہ ریختہ میں بھی تصوف کے خیالات پیش کئے ہوں گے۔

حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ (۶۶۱ تا ۷۸۲ھ) سلسلۂ فردوسیہ کے بافیض عظیم المرتبت بزرگ ہیں ان سے بھی ریختہ میں فالنامے ، کنج منڈے اور دوہے منسوب ہیں جس میں تصوف کے نکتے ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

شرنا گورڈراون نس اندھیاری رات   واں کوئی نہ پوچھے کہ کون تماری جات

مونس القلوب ملفوظا احمد لنگر دریا بلخیؒ (۸۲۶ تا ۸۹۱ھ) میں مذکور ہے کہ "جس رات حضرت مخدوم جہاں قدس سرہٗ نے انتقال فرمایا اسی رات حضرت مولانا مظفر بلخیؒ نے عدن میں خواب میں دیکھا کہ حضرت مخدوم جہاںؒ یہ دوہرہ پڑھ رہے ہیں ؎

آئیں رات سہانیاں   جن کارن دھکا کھائیاں"

یعنی وہ سہانی رات آگئی جن کے لئے میں نے اتنے دھکے کھاتے۔

حضرت مخدوم جہاںؒ کے مرید و جانشین حضرت مولانا مظفر بلخیؒ (المتوفی ۸۰۳ھ)

کے فارسی مکاتیب میں بھی اُردو دوہے ملتے ہیں ان میں کا ایک مشہور دوہا یہ ہے سے

باٹ بھلی پر ساکری نگر بھلا پر دور   بانہہ بھلا پر پاتلا ناری کرم چور

حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے خالہ زاد بھائی حضرت مخدوم سید احمد چرم پوش سہروردیؒ (المتوفی ۷۷۶ھ) فارسی کے صوفی شاعر تھے آپ کا بھی ایک ہندی دوہا آپ کے ملفوظ اضیاء الفلوب میں موجود ہے جس میں آپ زاہد و پارسا کا فرق بتاتے ہوئے فرماتے ہیں سے

میتا من نموننیہ سُر دمنی کہا سو ہوئے

اینہیں بید ھا بید ماں پہاں سر نہ کینی کوئے

مذکورہ بالا حقائق پیش کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں شمالی ہند کو تقدم اور تفوق حاصل ہے۔ اس لئے کہ پنجاب، دہلی، بہار میں بزرگان دین کے تربیتی فقرے، دوہے، ریختے، مندرے وغیرہم عہد قدیم کے یعنی ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے دستیاب ہوتے ہیں البتہ اردو شاعری کے ارتقا کا کوئی مربوط اور مسلسل خاکہ پیش کرنا مشکل ہے لیکن گجرات اور دکن میں نویں صدی ہجری سے باضابطہ طور پر تسلسل کے ساتھ اردو ادب و شعر کی روایت ملتی ہے اور نویں صدی ہجری میں تو دکن اور گجرات کے صوفیائے کرام نے مختصر رسالے بھی لکھے اور اپنی شاعری یعنی نظموں میں بھی صوفیانہ خیالات پیش کئے۔ چنانچہ ڈاکٹر وحید اختر اپنی تصنیف میں اس طرح رقم طراز ہیں :-

"گجرات کا علاقہ محمود غزنوی کے زمانے سے ہی مسلمانوں کے اثر میں آچکا تھا۔ دہلی سلطنت کے زمانے میں صوفیائے یہاں اپنی خانقاہیں قائم کیں اور عام لوگوں میں رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔ ان میں سے اکثر نے ابتدائی اردو کی ایک بولی گجری کو اظہار خیال کا وسیلہ بنایا، یہ حضرات عام بول چال میں گجری کا استعمال کرتے تھے، ان کے بہت سے جملے اور اقوال مولوی عبد الحق نے "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کے کام" میں نقل کئے ہیں۔ ان ہی میں سے بعض بزرگوں نے شاعری کے لئے بھی اسی زبان کا انتخاب

کیا۔ کیوں کہ شاعری کا بنیادی محرک بھی تصوف ہی تھا، زبان اور تحریر دونوں سے
تصوف کی تعلیمات کو عوام ہی کے دلوں میں ہی جاگزیں کرنا مقصود تھا اور عوام
سے قربت کا بہترین ذریعہ یہی تھا کہ بول چال کی زبان کو اختیار کیا جائے۔ دکن کے
دوسرے علاقوں میں خصوصاً بیجاپور کے کئی شاعروں نے بھی اپنی زبان کو گجری کہا
ہے، اس لئے یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ سب سے پہلے یہی بول چال اردو شاعری
کی زبان بنی۔ گجرات کے علاقے میں قادری، چشتی، جنیدی، شطاری، مغربی
حیدر روسی، رفاعی، سہروردی، نقشبندی، نور بخشی خانوادوں کے صوفیا
مختلف مقامات پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان ہی کی تحریری کارناموں نے اردو ادب
کی داغ بیل ڈالی۔ ان میں شیخ علی جیو گام دھنی، قاضی محمود دریائی، بہاء الدین
باجنؒ، خوب محمد چشتیؒ وغیرہ کے نام تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔[1]

گجرات کے سب سے پہلے اہم شاعر بہاء الدین باجنؒ ہیں جنہوں نے دوہے کے
علاوہ نظمیں بھی کہی ہیں جن میں تصوف کی روشنی ملتی ہے۔ دوسرے بزرگ حضرت شاہ علی محمد جیو
گام دھنیؒ کے یہاں طویل صوفیانہ مثنوی ملتی ہے جس میں توحید، معرفت اور بالخصوص ہمہ
اوست کے مسلک کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ قاضی محمود دریائیؒ نے بھی عشق حقیقی
کا راگ چھیڑا۔ گجرات کے مشہور بزرگ خوب محمد چشتیؒ کی مشہور صوفیانہ مثنوی خوب ترنگ
کو شاعرانہ عظمت حاصل ہے۔

دکن بھی تہذیب و ادب کا گہوارہ رہا ہے چنانچہ سلاطین ہند میں سے علاءالدین خلجی
اور محمد تغلق کے دورِ حکومت میں صوفیائے کرام کی آمد نے دکن میں نہ صرف رشد و ہدایت
کی بلکہ اس کی تہذیب و تمدن کو بھی سنوارا اور نکھارا۔ حقیقت یہ ہے کہ علاءالدین خلجی کے
عہد میں صوفیائے کرام کی آمد دکن میں ہوئی جنہوں نے رشد و ہدایت کا سلسلہ قائم کیا اور اخوت
و بھائی چارگی کا ایسا درس لوگوں کو دیا کہ عوام و خواص دونوں ہی ان سے قریب ہونے لگے

---

[1] خواجہ میر درد تصوف اور شاعری ص ۲۹ مصنفہ ڈاکٹر وحید اختر۔

اور تبلیغ اسلام اور توسیع سلسلہ کا کام تیزی کے ساتھ ہونے لگا۔ حسن اتفاق سے سلطان محمد تغلق نے اپنا دارالسلطنت دہلی سے دیوگری منتقل کر لیا تو اس کے ساتھ ہی ساتھ علمائے کرام اور صوفیائے عظام بھی دکن پہنچے۔ صوفیائے کرام کا طبقہ تو وہاں اپنے مشن میں سرگرم عمل رہا اور شعر و ادب کو بھی ذریعہ اظہار بنایا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کے سلاطین نے بھی علم و ادب کی سرپرستی کی اور وہ خود بھی صاحب ذوق شاعر تھے۔ لیکن صوفیائے کرام میں بیجاپور کے تین صوفی خانوادوں نے عوام کے دلوں پر گہرے نقوش ثبت کئے ہیں۔ ڈاکٹر وحید اختر لکھتے ہیں کہ :۔

"بیجاپور کے صوفیا میں تین خانوادوں نے عام زندگی پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ایک تو شیخ عین الدین گنج العلمؒ کے مریدوں کا سلسلہ ہے دوسرا خواجہ گیسو درازؒ کے خلفا کا سلسلہ اور تیسرا میراں جی شمس العشاق کا سلسلہ۔ ایک اور سلسلہ کا آغاز شاہ صبغت اللہ سے ہوا۔ اس طرح بیجاپور، گجرات، بیدر، گلبرگہ، شمالی ہند، ایران اور عرب کے مختلف عناصر کی آماجگاہ بن کر ادب کا قبلہ بن گیا۔ تصوف کا اثر عام زندگی پر اتنا مضبوط تھا کہ اس عہد کا وہ شعرا بھی جو صاحب معرفت نہیں کہلائے جا سکتے تھے کسی نہ کسی طرح تصوف کا رنگ قبول کرنے پر مجبور رہے۔ اس طرح اس دور میں بھی تصوف ہی ادب و شعر کا سب سے اہم موضوع رہا یا پھر دوسری خالص شاعرانہ اور ادبی تخلیقات کے لئے بالواسطہ محرک کا کام دیتا رہا ہے"[1]

بیجاپور کے صوفیا میں حضرت شاہ میراں جی شمس العشاقؒ کی مثنویاں خوش نامہ، خوش نغز، شہادت الحقیقت اور مغز مرغوب ہیں۔ یہ تمام مثنویاں صوفیانہ حقائق اور رموز معرفت کے موضوع پر ہیں۔ حضرت کے صاحبزادے حضرت برہان الدین جانمؒ کی مثنوی ارشاد نامہ میں بھی صوفیانہ حقائق کی جلوہ گری ہے۔ آپ کے صاحبزادے حضرت امین الدین اعلیٰؒ کے کلام بھی رموز معرفت پر مبنی ہیں۔ ان بزرگوں کے بعد ایک اور صوفی شاعر شہباز حسینیؒ بھی گذرے

---

[1] خواجہ میر درد، تصوف اور شاعری صفحہ ۲۹۶

میراجی کی ایک دو غزلیں بھی ملتی ہیں۔ عاشق دکنی نے بھی تصوف کے مسائل کو اپنی نظم میں پیش کیا ہے۔ شاہ ابوالحسن قادری نے بھی ایک مثنوی "سکھ انجن" لکھی ہے جو صوفیانہ خیالات پر مشتمل ہے۔ قاضی محمود بحری نے بھی "من لگن" نام کی ایک صوفیانہ مثنوی لکھی ہے۔

گولکنڈہ کے سلاطین اور شعراء نے اردو شاعری کی لو کو اور تیز کیا۔ بالخصوص ابراہیم قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ جیسے ادب نواز اور شعراء پرور بادشاہوں کی سرپرستی نصیب ہوئی تو ادب و شعر کے رجحان کو اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ محمد قلی قطب شاہ خود بھی شاعر تھا اور اردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کے کلام میں درد و عشق کی چاشنی کے ساتھ ساتھ تصوف کی بھی جلوہ گری ہے۔ اس کے عہد کے مشہور شعراء میں ملا وجہی کی شہرت اور مقبولیت زیادہ ہوئی۔ غواصی نے اپنی مثنوی طوطی نامہ میں صوفیانہ خیالات پیش کئے۔ ابن نشاطی نے "پھول بن" جیسی مثنوی لکھی لیکن شاہ راجو کی عظمت صوفی اور شاعر دونوں لحاظ سے تھی۔ غرض کہ گولکنڈہ اور بیجاپور میں اردو شاعری کی آبیاری اور سرپرستی بڑی شان و شوکت سے ہوئی اور عوام و خواص دونوں اس سے متاثر ہوئے۔

مذکورہ بالا حقائق کے تجزیے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اردو کی ابتدائی نشوونما دکن میں ہوئی اور سب سے پہلے صوفیائے کرام کے تربیتی فقرے ادو ہے اور دکنی مذہبی اردو کے نقوش اولیں ہیں جن میں صوفیانہ اسرار و رموز ہیں۔ شمالی ہند میں پنجاب، دہلی، بہار اور یوپی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اردو کی تشکیل اور ترویج میں انہیں تقدم اور تفوق حاصل ہے لیکن اردو نثر کے مختصر اور صوفیانہ رسالے اور اردو شاعری بالخصوص مثنوی نگاری میں صوفیائے دکن اور گجرات کو تقدم اور تفاخر حاصل ہے اس لئے کہ شمالی ہند میں نویں اور دسویں صدی ہجری میں مستند طور پر کوئی ایسی تحریر دستیاب نہیں بلکہ جنوبی ہند میں اس کی اتفاقی کیفیت نظر آتی ہے۔ اردو شاعری میں خصوصاً مثنویوں میں شعراء نے تصوف کے حقائق و معارف کو ضرور پیش کیا ہے لیکن ان میں تصوف کی ایسی رنگا رنگی اور ہم آہنگی نہیں جو شعرائے فارسی کا طرۂ امتیاز ہے۔ البتہ جب شعرائے اردو نے غزل کا ساز چھیڑا تو اس میں صوفیانہ اصطلاحات حسن کاری کے تقاضوں کے ساتھ نظر آنے لگے۔

اردو غزل اور تصوف

اردو غزل نے جب فارسی غزلوں کا رنگ و آہنگ اختیار کیا اور اس کی تشکیل او ر تعمیر ہوئی تو اس میں تصوف کے آب و گل سے خمیر تیار ہوا اور یہ سہرا ولی دکنی کے سر بندھا۔ ولی کی شاعری میں حسن و عشق کی کشاکش بھی ہے اور تصوف کا خمیر بھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب اردو غزل میں تصوف کے اصطلاحات کے ساتھ عشق مجازی و عشق حقیقی، واردات قلبی، عرفانِ الٰہی اور تزکیہ نفس و تصفیہ قلب کے خیالات و تجربات کی آمیزش ہوئی تو خیالات و کیفیات میں لطافت و سنجیدگی در آئی اور زبان و بیان میں بھی شیرینیت اور دلکشی پیدا ہوئی۔ اردو غزل میں صوفیانہ خیالات وقت کی پکار اور اس کے تقاضے تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی تحریر فرماتے ہیں:

> ''غزل کا مزاج دراصل عاشقانہ ہے۔ اس کے خمیر میں سب سے زیادہ جس چیز کا عنصر غالب ہے وہ حسن و عشق کے نغمے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ غزل کی آفاقیت اور لچک نے دوسرے تصورات کو اپنا تو لیا مگر ان کو اپنا خاص موضوع نہیں بنایا۔ تصوف کی بنیاد بھی چونکہ جمالیاتی تصور پر قائم تھی اس لئے غزل اور تصوف ایک دوسرے سے جلد مانوس ہو گئے۔ تصوف کی راہ سے جو بھی موضوع غزل میں داخل ہوئے وہ اس کے لئے اجنبی نہ تھے۔ رفتہ رفتہ تصوف نے غزل کے مزاج میں اس حد تک دخل پا لیا کہ وہ غزل پھیکی معلوم ہونے لگی جس میں تصوف کی چاشنی نہ ہوتی۔ کیا مومن کی ان کے عہد میں عدم مقبولیت کا ایک سبب یہ نہیں ہے کہ ان کا کلام تصوف کے عناصر سے خالی تھا۔ یہ ضرور ہے کہ تصوف غزل کا ایک اہم جزو تھا مگر یہ وہ سنگلاخ وادی تھی کہ ہر شخص کی ہمت اس وادی میں قدم رکھنے کی نہ ہوتی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ صوفیانہ شاعری تو رسمی طور پر نبھ جاتی تھی لیکن صحیح معنی میں صوفی شاعر ہونا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ اگر لوگ صوفیانہ اشعار کہتے بھی تھے تو اس لئے کہ غزل کا رجحان غالب وہی تھا اور یہ محرک اس قدر قوی تھا کہ ہمارے شعراء عقیدہ کے لحاظ سے خواہ صوفی بھلا ہے نہ ہوں مگر صوفیانہ اشعار کہنا فرض خیال کرتے رہے۔ صوفی شعرا یہ وہ افراد تھے

جو ورائے شاعری چیزے دیگر کے ساتھ بیان کی سنجیدگی، لب و لہجہ کی نرمی، زندگی کے پوشیدہ رموز سے آگہی، فنائیت اور سپردگی، نامرادی و برگشتگی، استغنا و بے نیازی کے اوصاف سے متصف تھے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے امتزاج سے صوفیانہ خمیر تیار ہوتا ہے اور جب کسی شاعر کے یہاں یہ خصوصیات زمانہ کے نشیب و فراز یا ذہنی صلاحیت کے باعث نمایاں ہوتی ہیں تو ہم اس کو صوفی کہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اردو شاعری میں صوفیانہ شاعری کی تو فراوانی ہے مگر صوفی شاعر معدودے چند ہی ہوئے ہیں۔[1]

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اردو شاعری تصوف کے بغیر بے جان ہے یعنی قالب تو ہے لیکن روح نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا کے ساتھ ہی ساتھ تصوف کے خیالات و افکار بھی داخل ہوتے رہے۔ قدیم شعراء کسی نہ کسی شکل میں مسائل تصوف پر غور و فکر کرتے رہے اور اپنے تجربات و مشاہدات کو بھی شعری جامہ پہنایا۔ زندگی کی حقیقت، خدا کا وجود، بے ثباتی عالم، فنا و بقا، عشق مجازی و عشق حقیقی، وحدت الوجود اور وحدت الشہود غرض کہ اسی قسم کے اور تصوف کے مسائل شعرا کے دل میں پرورش پاتے رہے اس لئے ابتدا سے اب تک اردو شعراء کسی نہ کسی شکل میں صوفیانہ افکار کو اپنے اشعار میں پیش کرتے رہے ہیں جب ہم ان حقائق پر غور و فکر کرتے ہیں تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اردو زبان و ادب کی تخلیق اور نشو و نما صوفیائے کرام ہی کی مرہون منت ہیں۔ ان کا خلوص و محبت اور اخوت انسانی عوام کی توجہ کا مرکز اور کشش کا سامان بنی۔ عوام جوق در جوق ان کے حلقہ بگوش ہوئے، ساتھ ہی ساتھ علماء اور شعرا بھی ان کی دعاؤں کے محتاج اور ان کی توجہ کے طالب۔ اس لئے کسب فیض کے لئے ان کی خدمت میں جاتے اور ان کے صوفیانہ خیالات سے متاثر ہوتے۔ اس کے علاوہ وہ صوفیا خود بھی صاحب سجادہ، علوم ظاہر و باطن سے آراستہ اور شاعر ہوتے۔ ان کی شاعری میں بھی اسی حقیقت کی ترجمانی ہوتی۔

---

[1] فانی کی شاعری ص ۶۵-۶۶ مصنفہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی۔

دوسری وجہ اردو شاعری میں تصوف کے اثر انداز ہونے کی یہ بھی ہے کہ اردو شاعری فارسی شاعری سے براہ راست متاثر ہوئی۔ فارسی شاعری میں صوفیانہ خیالات کی ترجمانی، حقائق و معارف کی آگہی، واردات قلبی کی اثر پذیری، مشاہدات کی جلوہ سامانی کی اتنی شدت اور کثرت تھی کہ اردو زبان و ادب اس سے دامن نہ بچا سکی اور اردو شاعری میں بھی وہ خیالات فنی لفاظوں کے ساتھ داخل ہوئے۔ حضرت مولانا روم، حکیم سنائی، اور عطار کی عارفانہ مثنویوں میں جو رموز و معرفت پیش کئے گئے ہیں ان سے اردو مثنوی متاثر ہوئی اسی طرح سعدی، حافظ، عراقی، امیر خسرو، جامی کی فارسی غزلوں میں جو عشق حقیقی کی چوٹ، درد و کرب کی کسک، والہانہ کیف و کم، مظاہر خداوندی، واردات قلبی اور داخلی کوائف کی کیفیات نظر آتی ہیں ان ہی سے اردو غزل بھی متاثر ہوئی۔ مختصر یہ کہ اردو شاعری میں تصوف کی جلوہ گری فارسی شاعری کی دین ہے۔

اردو کی صوفیانہ شاعری بالخصوص صوفیانہ غزلوں کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو دو مکتبۂ فکر کے شعراء نظر آتے ہیں اگرچہ ان کے افکار و تخیل میں کوئی فرق یا تضاد نہیں لیکن عملی طور پر مختلف نظر آتے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو عملی طور پر مسند سجادگی پر فائز ہو کر رشد و ہدایت کا درس دیتے تھے اور اپنے کوائف داخلی، سوز دروں اور عشق حقیقی کو اشعار کے قالب میں ڈھالتے۔ ان کے محسوسات اور تجربات میں ان کا عملی پہلو رہتا۔ ان کے دل پر جو کیفیتیں گذرتیں ان سے بے قابو ہو کر حالت اضطراب میں اس کا اظہار کرتے۔ سجادگان طریقت کی شاعری میں اسی حقیقت کی ترجمانی ہے۔ اردو کے صوفی شعراء جو مسند سجادگی اور ارشاد طریقت پر فائز رہے ان میں حضرت شاہ کمال دیوروئیؒ، مظہر جانجاناںؒ، غلام نقشبند سجادؒ، رکن الدین عشقؒ، خواجہ میر دردؒ، آیت اللہ جوہریؒ، نور الحق تپاںؒ، نیاز بریلویؒ، تراب علی قلندرؒ، فرد پھلواروی، وجد بہاریؒ، فانی گیاوی، شوق بہاریؒ، آسی غازیپوریؒ، صوفی منیریؒ، اکبر داناپوریؒ، عاصی قادریؒ، رضا فاضل بریلویؒ، مرشد قادریؒ، کامل اسلام پوریؒ، محسن داناپوری اور رفاقی گورکھپوری اپنے صوفیانہ اشعار اور عارفانہ کلام کے آئینے میں گرانقدر اور ممتاز نظر آتے ہیں۔

صوفی شعراء میں کچھ ایسے بھی ہیں جو مسند سجادگی پر جلوہ افروز ہوئے نہ پیر طریقت

کی حیثیت سے عمل پیرا ہوئے لیکن حلقہ ارادت میں آ کر سلوک کی منزلیں طے کیں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی میں فنا ہو کر تجربات و مشاہدات سے ہمکنار ہوئے ، ان ہی کیفیات کو اپنے اشعار میں پیش کیا۔ ان میں ولی دکنی ، سراج اورنگ آبادی ، مرزا مظہر ، غلام یحییٰ حضور ، غمگین دہلوی ، کمال چشتی ، بے نظیر شاہ وارثی اور بیدم شاہ وارثی عظمت کے حامل ہیں ۔

دوسرا مکتبۂ فکر ایسے شعراء نے تصوف کا ہے جو نہ تصوف کے عملی مسائل سے واقف ہیں نہ سلوک و معرفت کی منزلوں سے آشنا ہیں لیکن ذوق و وجدان کی وجہ سے اور صوفیانہ علم و فن کی آگہی کے سبب وہ مسائلِ تصوف کو اپنے اشعار میں جگہ دیتے اور فنکارانہ طور پر اسے اس طرح پیش کرتے جیسے وہ اس راہ کے راہرو ہیں اور اسی لئے میں انہیں شعرائے تصوف کے نام سے موسوم کرتا ہوں ۔ ان میں میر تقی میر ، آتش ، غالب ، اقبال ، فانی بدایونی اور اصغر گونڈوی ممتاز ہیں ۔

بعض اردو کے شعراء ایسے بھی ہیں جنہوں نے تیمناً اور تبرکاً حصولِ برکت اور نجات کے لئے صوفیانہ اشعار کہے ہیں ۔ میں نے انہیں نظر انداز کیا ۔ یہی وہ اسباب ہیں جن کے باعث اردو شاعری میں صوفیانہ خیالات پروان چڑھے اور اس کی مقبولیت اور شہرت ہوئی ۔

حضرت شاہ کمال علی کمالؔ دیوروی

صوبہ بہار میں مجاجنیری بزرگانِ دین، مجاہد کی حیثیت سے بھی آئے اور صوفی با صفا کی حیثیت سے بھی۔ یہ خاندان اپنی قدامت اور بزرگی کے اعتبار سے مشہور و معروف ہے۔ حضرت شاہ کمال علیؒ اسی خاندان کے ایک فرد ہیں۔ آپ کا نسب نامہ پدری اس طرح ہے:-

"کمال علی ابن سید فیض علی قادری الگیاری المجاجنیری بن مولانا نصراللہ عرف محمد نصیر خاں بن سید حسین بن میر سید محمد بن میر سید آدم"[1]

آپ کی نانیہال مقام دیورہ ضلع گیا میں ہے۔ آپ کا نسب نامہ مادری حضرت مخدوم شاہ شعیب فردوسیؒ (موضع شیخ پورہ ضلع مونگیر) کے خلیفہ در خلیفہ حضرت مخدوم شاہ برہان الدین فردوسیؒ تک پہنچتا ہے۔ حضرت شاہ کمال علی اپنے عہد کے مشہور بزرگ، حضرت شاہ غلام علی فردوسیؒ دیوروی کے نواسے تھے۔ آپ کی پیدائش اپنے نانیہال دیورہ میں ۱۰۹۰ھ میں ہوئی (ایک قدیم فرمان خانقاہ کمالیہ میں ہے جس پر قاضی غلام حیدر کی مہر ثبت ہے اور وہ ۱۱۰۹ فصلی مطابق ۱۱۱۱ھ کی تحریر ہے اس میں شاہ کمال علی کو جاگیر دی گئی ہے اس اعتبار سے آپ کی تاریخِ ولادت خاندانی روایت کے اعتبار سے ۱۰۹۰ھ درست ہے) ابتدائی تعلیم اپنے نانا حضرت شاہ غلام علی دیورویؒ سے ہوئی اور پھر اپنے والد شاہ فیض علیؒ سے بھی پڑھا۔ اس کے بعد جب طلب علم کا شغف بڑھا تو آپ عظیم آباد تشریف لے گئے اور شاہ عزیزاللہ پلاسوی کے مدرسہ میں ملا میر زاہد علی میرٹھی کے زیر تعلیم رہے اور حدیث و فقہ میں کمال پیدا

---

[1] نسب نامہ فیض ازل قلمی مصنفہ حضرت سید فیض علی۔ خانقاہ برہانیہ کمالیہ دیورہ۔

کیا علم کا شغف اور بڑھا تو آپ لکھنؤ تشریف لے گئے اس وقت علمائے فرنگی محل اپنے علم وفضل کی وجہ سے مرکزی حیثیت رکھتے تھے چنانچہ آپ وہاں حضرت ملا نظام الدین فرنگی محلی کے زیر تعلیم رہے۔ بعض روایت کے اعتبار سے یہ مشہور ہے کہ آپ مولانا بحر العلوم فرنگی محلی سے پڑھتے تھے۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد تعلیم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کی تعلیم باطنی اپنے نانا حضرت شاہ غلام علیؒ سے ہوئی اور آپ ہی کے دست حق پرست پر بیعت بھی ہوئے لیکن آپ کو اجازت وخلافت اپنے ماموں حضرت غلام ولی دیوروی سے ملی۔ مرشد نے آپ کے علم باطنی کی تکمیل کی اور درجہ کمال کو پہنچا دیا۔ پیر و مرشد کے وصال کے بعد آپ کے معاصرین بزرگوں نے آپ کو خانقاہ بربانیہ کے لئے منتخب فرمایا لیکن آپ نے اپنے پیر ومرشد کے نواسے شاہ خادم علی کو مسند سجادگی پر بٹھایا۔ آپ کا وصال ۱۲۱۵ھ میں ہوا گویا آپ نے طویل عمر پائی اور دیورہ ہی میں مدفون ہوئے۔

آپ فطری شاعر تھے اور شعر وسخن سے گہری دلچسپی تھی لیکن اس کا اشتیاق اس وقت زیادہ ہوا جب آپ بغرض تعلیم لکھنؤ میں قیام پذیر تھے۔ اس وقت لکھنؤ میں شعر وسخن کا زیادہ زور تھا۔ مشاعروں کی جلوہ آرائیاں اپنے شباب پر تھیں۔ لیکن ابھی تک یہ پتہ نہ چل سکا ہے کہ آپ مشاعروں میں شرکت فرماتے تھے یا نہیں۔ آپ نے غزلیں بھی کہی ہیں جو بڑی تقطیع کے باون صفحات پر مشتمل ہے جس میں ۷۰۱ اشعار ہیں۔ بارہ مثنویاں بھی اردو میں کہی ہیں جن کے اشعار کی تعداد ۵۶۶ ہے۔ آپ کا دیوان مخطوطہ کی شکل میں اب تک محفوظ ہے جو خانقاہ بربانیہ کمالیہ کی زینت ہے۔ ۱۹۷۸ء میں راقم الحروف، پروفیسر عطا کریم برق صدر شعبۂ فارسی کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ خانقاہ مذکور میں حاضر ہوا اور شاہ منصور احمد فردوسی سجادہ نشین خانقاہ کمالیہ کے چھوٹے بھائی شاہ انور علی سلمہٗ کی وساطت سے اس گراں قدر دیوان کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ حضرت شاہ کمال علی کی شاعرانہ شہرت اپنے عہد میں ہو چکی تھی۔ اسی لئے آپ کے معاصر تذکرہ نگار غلام حسین شورش نے اس طرح لکھا ہے:۔

"کمال علی ولد سید فیض علی بن سید محمد نصیر خاں، کمال تخلص، ساکن قصبہ گیا مان پور نبیرہ حضرت شاہ غلام علی قدس سرہ العزیز، متوطن موضع

دیورہ، پرگنہ اردل، فاضل جید شاگرد حضرت مولوی محمد وحید قدس سرہٗ شاعر فارسی. گاہ گاہ فکر ریختہ ہم می نماید از وست" ؎

لیلیٰ چھپی ہے عکس ہو پردے میں آب کے
پھرتے انا گستہ میں محمل حباب کے

پیری میں دم سرد نہ ہوں کیونکے غنیمت
کھل جاوے ہے غنچہ کی گرہ باد سحر سے[۱]

حضرت شاہ کمال علیؒ صوفی باصفا تھے اور شاعر باکمال بھی۔ آپ کے اشعار میں تصوف کا گہرا امتزاج ہے۔ تصوف کے مختلف نکات کو نہایت خوش اسلوبی سے دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس کا اندازہ تو آپ کے کلام سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ ایک غزل کے تین اشعار ملاحظہ ہوں ؎

گر عزم کرے اس کی تجلی کے بیاں کا — روشن ہے جلے شمع صفت تازہ زباں کا
کب تیر خطا ہووے اوس ابرو کے کماں کا — اس سینۂ زخمی سے سمجھ حال نشاں کا
کب قافلہ وادی کوں محبت کی کرے طے — یاں یدرقہ حیرت سے ہوا سنگ نشاں کا

دوسری غزل کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں جس میں تصوف کی چاشنی بھی ہے اور تغزل کی رنگا رنگی بھی۔ ملاحظہ ہوں۔ ؎

عجب کہ یاد میں وہ زلف مشک سا نہ رہے — وہ کون سر ہے کہ جس سر میں یہ ہوا نہ رہے
خیال یار کا رہتا ہے چشم گریاں سوں — جہاں کہ چشمہ نہ جاری ہو کارواں نہ رہے
جو وصل ہو کبھی میسر تو کیا کہوں احوال — دو چار یار کے منہ سوں میری زباں نہ رہے
عجب کہ موسم پیری میں خواب غفلت ہو — کہ صبح ہوتے سرا بیچ کارواں نہ رہے
جسے شعور ہے کچھ بھی وہ اس قدر جانے — قضا بھی کچھ ہے اگر بندۂ رضا نہ رہے

۱؎ تذکرۂ شورش مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی۔

یہ بادیہ میں محبت کے بے دلیل نہ جا	کہ کارواں کو خطر ہے جو رہنما نہ رہے
خطر ہے بحرِ خرد میں اگر جنوں نہ سوے	جہاز غرق ہو گر اس میں ناخدا نہ رہے

مثنوی میں بھی تصوف کے ساتھ عشقِ حقیقی کی کیفیتوں کو بیان کیا ہے۔ مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

محبت سر بسر اعجاز سمجھو	محبت کو خدا کا راز سمجھو
محبت سے فلک رقصاں ہے دائم	محبت سے زمیں دریا پہ قائم
محبت مظہرِ سرِّ خدا ہے	ہمائے اوجِ عرشِ کبریا ہے
محبت مور کو کر دے سلیماں	گدا اور شاہ کو کر دیوے یکساں[1]

---

[1] دیوان حضرت کمال ادیوری قلمی۔

حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ

حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ وہ صوفی با صفا اور کشتۂ زہد و فا تھے جنہوں نے اگر ا
مکاتیب اور ملفوظات کے ذریعہ رشد و ہدایت کی تعلیم کی، زندگی گزارنے کا سلیقہ بتایا، اخلا
و محبت، چارہ سازی، طمانیت قلب، تزکیۂ نفس کا درس دیا تو شعر و شاعری کے ذریعہ بھی
نے دل کو چھیڑا۔ عشق مجازی اور عشق حقیقی کی دہکتی دہکتی آنچ سے سوز و گداز پیدا کیا۔ وحد
الوجود اور وحدت الشہود کے مسلک میں بھی کشش اور جاذبیت پیدا کی۔ غرض کہ حضرت
مظہر جانجاناںؒ دنیائے تصوف کے وہ درخشندہ ستارہ ہیں جن کی تابانی سے فارسی اور ار
شاعری دونوں تابندہ ہیں۔ ان کے افکار صوفیانہ ہے اردو شاعری کا منزہ اور مصفا ہو
آپ صوفی باعمل تھے اس لئے صرف فنی اور علمی طور پر تصوف کا مشاہدہ نہیں کیا بلکہ عملی اور
اعتبار سے بھی اپنے صوفیانہ خیالات کو شعر کے قالب میں ڈھالا اور اردو شاعری کے ذ
سعی پیہم اور جہادِ زندگانی کی ترغیب دی ہے۔ آپ کا مسلک اور مشرب دونوں صوفی
تھا۔ چونکہ آپ مسند سجادگی پر متمکن تھے اس لئے رشد و ہدایت اور اخلاص و محبت کا
درس دیتے رہے۔ آپ کا زمانہ بڑی بدامنی اور شوریدگی کا زمانہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آ
نے کتنے انقلابات دیکھے۔ دلی کی تباہی اور بربادی دیکھی، شرفاء، اہل ہنر، شعراء ا
اور علماء کی بے پناہی اور ناقدری دیکھی۔ یہ وہ دور تھا کہ بڑے بڑے عظیم المرتبت
فقر و توکل کے پائے استقامت میں بھی لغزش پیدا ہو گئی لیکن حضرت مظہر جانجاناںؒ
برگزیدہ شخصیت نے اپنا قدم تسلیم و رضا سے باہر نہیں نکالا اور ان کے پائے تو
میں کوئی بھی فرق نہیں آیا۔ مستند تذکرہ نگار مولوی قدرت اللہ نے اپنے تذکرہ میں حضر

کے متعلق اس طرح تحریر فرمایا:۔

"زبدۃ العارفین، قدوۃ الواصلین، واقف رموز جناب اکبر، کاشف کنوز طریقہ پیغمبر مرزا مظہر جانجاناں مروت فرشتہ صفت، علوی نسب، ہندی مولد، حنفی مذہب، نقشبندی مشرب"۔ [1]

آپ کا اسم شریف شمس الدین جانجاناں اور تخلص مظہر تھا۔ آپ کے والد مرزا جان شہنشاہ عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے۔ آپ کی پیدائش ۱۱ رمضان المبارک سنہ ۱۱۱۳ھ میں کالا باغ علاقہ مالوہ میں ہوئی [2] لیکن تمام تذکرے میں آپ کی تاریخ پیدائش سنہ ۱۱۱۱ھ درج ہے۔ آپ نے اپنی عمر کے اٹھارہویں برس میں قدم رکھا تھا کہ آپ اپنے مشفق باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ معمول کے مطابق تمام کتب ہائے درسیہ علمائے دہلی سے پڑھیں۔ علامہ شیخ محمد افضل سیالکوٹیؒ، جو اس زمانے میں یگانۂ روزگار تھے اور شیخ المحدثین کی حیثیت سے بھی مشہور تھے، ان سے درس حدیث لیتے رہے اور اس میں کمال پیدا کیا۔ تکمیل علوم ظاہریہ کے بعد تحصیل علوم باطنی میں بھی مشغول ہو گئے اور اس کا شغف ایسا ہوا کہ تیس برس تک جلیل القدر مشائخ نقشبندیہ سے اکتساب فیض کرتے رہے۔ حضرت سید نور محمد بدایونیؒ اور حضرت سعد اللہ گلشنؒ سے اکتساب فیض کیا۔ حضرت محمد عابد السنامیؒ [3] کے دست حق پرست پر بیعت کی اور تمام منازل سلوک طے کرنے کے بعد اجازت و خلافت سے نوازے گئے۔ حضرت نے انہیں اپنے مسند سجادگی پر بھی جلوہ افروز کیا۔ آپ کی خانقاہ فیض پناہ سے رشد و ہدایت اور اخلاص و محبت کا فیضان جاری ہوا۔ تمام سلاسل کے ساتھ ساتھ سلسلۂ نقشبندیہ کی مرید دست ہوئی

---

[1] نکات الشعراء مصنفہ مولوی قدرت اللہ صدیقی تالیف سنہ ۱۱۹۶ھ [2] مولینا سید عبدالباری آسی نے ایک مضمون حضرت مرزا مظہر جانجاناں پر ندیم ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء میں تحریر کیا ہے جس میں تاریخ پیدائش سنہ ۱۱۱۳ھ ہے اور یہ خود حضرت مرزا صاحب کے فارسی دیوان کے دیباچے میں آپ کے دست خاص کا تحریر کردہ ہے [3] حضرت عابد السنامی وہ حضرت شیخ عبدالاحد کے مرید ہیں اور وہ شیخ محمد سعید کے اور وہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مرید ہیں۔ مظہر جانجاناں مظہر الشہید عن شیخ عابد السنامی عن شیخ عبدالاحد عن شیخ محمد سعید عن امام ربانی مجدد الف ثانی احمد فاروقی السرہندی یہ سند میرے والد حضرت شاہ ایوب ابدالی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے مرشد اور استاد مولانا محمد رفیق قادریؒ نے دیا ہے جن کو سنہ حج کے موقع پر عبدالحق مہاجر مکیؒ نے اجازت و خلافت سے سرفراز کیا ہے۔ (مخطوطہ سنہ ۳۴ء)

حضرت کے توکل وقناعت کا یہ حال تھا کہ جس وقت دلی اُجڑی، تو دوسروں نے اس وقت آپ کو سہارا دینا چاہا لیکن حضرت نے اسے کبھی قبول نہیں کیا۔ مصنف گل رعنا نے مقامات مظہری کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ :۔

"اور بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ ساری عمر کسی بادشاہ یا وزیر کے سامنے سر نیاز خم نہیں کیا ایک بار محمد شاہ نے نواب اعتماد الدولہ قمرالدین خاں کو بھیج کر کہلا بھیجا کہ اتنا بڑا ملک خدا نے مجھ کو دیا اس میں جو کچھ چاہیے قبول فرمائیے۔ ہنس کر فرمایا "قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ" خدا نے ہفت اقلیم کو قلیل کہا۔ پھر ایک اقلیم میں سے ایک ولایت آپ کے حصے میں آئی ہے وہ کتنی ہے کہ فقیر اس کی طرف طمع کا ہاتھ بڑھائے"[1]

دلی کی تباہی و بربادی کے وقت دو خانقاہیں ایسی تھیں کہ جو عوام کے درد کا درماں اور بے سہاروں کا سہارا تھیں۔ ایک آپ کی خانقاہ اور دوسرے خواجہ میر درد کی خانقاہ۔ دونوں ہی سے سلسلہ نقشبندیہ کا فیضان جاری تھا اگرچہ دوسرے سلاسل کے فیوض و برکات بھی جاری تھے۔ حضرت کے وصال کی کیفیت مصنف گل رعنا نے اس طرح لکھی ہے :۔

"ساتویں محرم تھی کہ رات کے وقت ایک شخص آیا۔ دروازہ بند تھا اس نے آواز دی۔ باہر نکلے تو اس نے ایک قرابین ماری۔ وہ بھاگ گیا لیکن حضرت کو زخم کاری رہا۔ تین دنوں تک استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ زندہ رہے۔ عالم اضطراب میں لوٹتے تھے اور اپنے اشعار پڑھتے تھے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن | خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را
سیل خوں از سینہ گردم رواں کرد است عشق | تا تماشا زش کہ طوفان از تنور آوردہ است
زخم دل مظہر مبادا بہ شود آگاہ باش | کایں جراحت یادگار ناوک مژگان او

بادشاہ نے کہلا بھیجا قاتل نہیں ملتا۔ پتہ بتائیں تو ہم اس کو سزا دیں۔ جواب میں فرمایا کہ فقرا کشتہ راہ خدا ہیں۔ مردہ کا مارنا قتل نہیں۔ قاتل ملے تو آپ سزا نہ دیں۔ آخر دسویں محرم ۱۱۹۵ھ کی شام کو اہلبیت کرام سے جا ملے"[2]

---

[1] گل رعنا مصنفہ حکیم عبدالحی صفحہ ۱۲۳-۱۲۲ [2] گل رعنا مصنفہ حکیم عبدالحی صفحہ ۱۲۸ ۔

مرزا صاحب کے اندر جذبۂ عشق موجزن تھا۔ وہ عشق حقیقی سے سرشار تھے۔ ان کا دل عشق الٰہی میں اتنا بریاں تھا کہ ان کے اشعار میں وہی کیفیت اور تاثیر ہے۔ عبدالرزاق قریشی اپنی تحریر میں فرماتے ہیں کہ :۔

"وہ خود کو خلیل عشق کے لقب سے یاد کرتے تھے اس لئے ہر غم ان کا مہمان ہوتا تھا ان کے یہاں وصل کی تمنا اور ہجر کی بے قراری ضرور ہے لیکن محرومی یا مایوسی نہیں۔ تڑپ اور فریاد ہے لیکن نالہ و شیون نہیں اور صدائے ماتم نہیں۔ ان کی فغاں، فغان خاموش ہے"[1]

مرزا صاحب فطری شاعر تھے اور صوفی باعمل۔ اس لئے انہیں صوفی شاعر کہا جاتا ہے اردو شاعری کو تصوف کے ذریعہ انہوں نے نیا رنگ و آہنگ بخشا۔ مرزا کے کلام میں عشق مجازی کا رنگ بھی ہے اور عشق حقیقی کا آہنگ بھی اور تصوف و معرفت کی یہی جان ہے۔ اب آپ کے کلام کی روشنی میں اس حقیقت کا تجزیہ کیا جائے۔

حضرت مرزا کا اردو کلام زمانہ کے دست برد سے محفوظ نہ رہ سکا یا وہ خود اس کی طرف کم متوجہ ہوئے وہ اتنے زیادہ نہیں ہیں کہ اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جا سکے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہر فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر

تسلیم و رضا کی تعلیم ؎

توفیق دے کہ شور سے اکدم وہ چپ رہے آخر وہ میرا دل ہے الٰہی جرس نہیں
خدا کو اب تمہیں سونپا ہے اے دل یہیں تک تھی ہماری زندگانی

حضرت مرزا کی یہ مشہور غزل ہے جسے میں تذکرہ شورش سے نقل کر رہا ہوں جس میں کتنا درد و تاثیر ہے اور کیف و آگہی بھی ؎

گئی آخر جلا کر گل کے ہاتھوں آشیاں اپنا نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

---

[1] مرزا اور ان کا اردو کلام، مصنفہ عبدالرزاق قریشی ص ۱۸۳

ہمارے ساتھ سے یہ دل بھی بھاگا لیکے جاں اپنا ۔۔۔ ہم اوس کو جانتے تھے دوست اپنا، مہرباں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے ۔۔۔ اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا
میرا جلتا ہے جی اوس بلبل بیکس کی غربت پر ۔۔۔ کہ گل کے آسرے پر جس نے چھوڑا آشیاں اپنا
کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو بھی ظالم ۔۔۔ یہ دولت خواہ اپنا، مظہر اپنا، جانجاں اپنا[1]

رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی ۔۔۔ مجھے ناحق ستایا ہے یہ عشق بدگماں اپنا
جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے ۔۔۔ غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا[2]

تذکرۂ شورش میں حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے متعلق یہ تحریر ہے :-

"ذات شریف از علائق دنیا مطہر۔ حضرت مرزا جانجاناں مظہر اکبر آبادی والد آں حضرت مرزا جان نام داشت۔ از فرط محبت و شفقت مرزا جانجاناں می گفت ازیں سبب ہمیں اسم موسوم گشتہ۔ در علم ظاہر و باطن فرید وقت است۔ خوش تقریر بمرتبہ است کہ در تحریر نمی گنجد۔ دیوان مختصر شعر فارسی در عظیم آباد رسیدہ و اشعار ریختہ در اوائل ازاں شہرت یافتہ۔ اگرچہ شعر گفتن دون مرتبہ است لیکن گاہے متوجہ ایں فن بے حاصل نیز می شوند۔ انعام اللہ خاں یقین و میر محمد باقر حزیں ہر دو شاعران ریختہ شاگرد مستعد آں جناب اند در فارسی فقیہ صاحب درد مند و منشی بساون لعل بیدار۔"[3]

ترجمہ : حضرت مرزا مظہر جانجاناں اکبر آبادی کی ذات علائق دنیا سے پاک وصاف تھی آپ کے والد نے آپ کا نام مرزا جان رکھا۔ فرط محبت و شفقت سے مرزا جانجاناں کہتے تھے اسی وجہ سے اسی نام سے مشہور ہو گئے۔ علم ظاہر و باطن میں یگانۂ روزگار تھے۔ اس درجہ کے خوش تقریر تھے جو تحریر میں نہیں آسکتی۔ آپ کے فارسی اشعار کا مختصر دیوان عظیم آباد آیا اور آپ کے ریختہ اشعار بھی اسی سے مشہور ہوتے۔ اگرچہ شعر کہنا آپ کے لئے باعث ننگ ہے لیکن کبھی کبھی اس فن کی طرف بھی متوجہ

---

[1] تذکرۂ شورش صفحہ ۲۸۱ [2] یہ دو اشعار دو نسخوں میں زائد ہیں [3] تذکرۂ شورش صفحہ ۲۸۰

ہوتے ہیں یا نعام اللہ خاں یقین اور میر محمد باقر حزیں دونوں ریختہ کے شاعر آپ کے شاگرد ہیں۔ بقیہ صاحب درد مند اور منشی بساون لعل بیدار فارسی ہیں آپ کے شاگرد ہیں۔[۱]

مرزا صاحب کے اشعار میں کیف و سرور بھی ہے اور درد و سوز بھی ؎

اتنی فرصت دے کہ رخصت ہو لیں اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آباد ہم

الٰہی مت کسو کے پیش بار انتظار آوے
ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

تجلی گر تیری پست و بلندان کو نہ دکھلاتی
فلک یوں چرخ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرش ہو جاتی

توفیق دے کہ شور سے الکدم تو چپ رہے　　آخر یہ میرا دل ہے الٰہی جرس نہیں

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے　　کہاں اوس کو دماغ اور دل رہا ہے
نہیں ملتا کسی تکیے سے آرام　　یہ سر یا دل سے تیرے بل رہا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو　　یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

۱؎ تذکرہ شورش، ص ۸۳-۲۸۲

حضرت غلام نقشبند سجادؒ

حضرت عماد الدین قلندرؒ صوبہ بہار کے وہ عظیم المرتبت بزرگ ہیں جن کی شہرت بزرگی کے اعتبار سے بھی ہے اور اردو ادب کے شاعر و نثار کی حیثیت سے بھی۔ اردو نثر نگاری اور شاعری میں ان کو تفوق اور تقدم حاصل ہے۔ حضرت غلام نقشبند سجادؔ انہی کے صاحبزادے اور جانشین ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ نے ادب نوازی ورثے میں پائی تھی۔

آپ کا اسم شریف غلام نقشبند اور نسبت قلندر ہے اور آپ کا تخلص سجاد ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۱۱۶ھ میں ہوئی۔ آپ کے چچا حضرت شاہ ابو تراب قلندرؒ نے آپ کے سنہ پیدائش کی تاریخ "شمع خاندان" سے نکالا ہے۔ ابھی آپ آٹھ ہی برس کے ہوئے تھے کہ اپنے باپ کے سایۂ رحمت سے محروم ہوئے۔ اس لئے اپنے والد حضرت خواجہ عماد الدین قلندر کے فاتحہ چہارم کے روز حضرت تاج العارفین پیر مجیب اللہ قدس سرہٗ جو آپ کے والد کے ماموں زاد بھائی اور مرید و خلیفہ تھے، آپ کی بیعت لے کر ۲۳ جمادی الاول ۱۱۲۴ھ کو آپ کے والد کی سجادگی پر آپ کو فائز کیا اور تعلیم و ظاہری و باطنی میں آپ کو مشغول کیا۔ تعلیم ظاہری و باطنی کی تکمیل کے بعد ۱۱۳۵ھ میں اجازت و خلافت سے بھی نوازا۔ حضرت تاج العارفین نے آپ کو اپنی دامادی کا بھی شرف بخشا۔ آپ کا وصال ۱۱۷۳ھ میں ہوا اور اپنے والد کے پائیں میں مدفون ہوئے۔ پھلواری شریف میں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔ آپ کے وصال کے بعد آپ کے سجادہ نشیں آپکے داماد نور الحق تپاں ہوئے۔

حضرت سجادؔ صوبہ بہار میں اردو شاعر کی حیثیت سے اور خصوصیت کے ساتھ صوفی شاعر کی حیثیت سے ممتاز اور منفرد ہیں۔ حضرت رکن الدین عشقؔ سے پہلے

خانقاہ عمادیہ کے صاحب سجادہ ہو کر ایک طرف رشد و ہدایت کی تعلیم دے رہے تھے تو دوسری طرف اردو شاعری میں صوفیانہ رنگ کی آمیزش کر کے عشق حقیقی کی آگ سے اہلِ دل کو کیف آگیں بنا رہے تھے۔ حضرت سجاد کے کلام میں جو سوز و گداز، عشق حقیقی کی گرمی اور سوز دروں کی کیفیتیں پائی جاتی ہیں وہ انہیں عرفی شاعری کی حیثیت سے انفرادیت بخشتی ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جب موسم گل ان کی تائید کرے ہے — تب جوشِ جنوں عقل کی تردید کرے ہے
جو ہیچ محبت کے فنا مجھ سے ہے اے دل — حاصل تو وہی ہستی جاوید کرے ہے
سجاد جو سمجھا ہے خود اپنے تئیں موجود — وہ فہم نہیں معنی توحید کرے ہے

حضرت سجاد کی ایک مشہور غزل ہے جس میں عاشقانہ رنگ بھی ہے اور صوفیانہ رنگ و آہنگ بھی۔ ملاحظہ کیجیے! ؎

بھٹی کو چلا کیا ہو سے سحر پوچھو تو کوئی سجاد ستی
تھا رات ملک تو کام اس کا اشغال ستی اور اد ستی

تنہائی فرقت میں کیا کیا اپنا نہ یہ دل گھبراوے ہے
بہلے ہے جو ٹک یہ ناشدنی تو صرف تمہاری یاد ستی

جب آگ دھندھکتی ہو اس پر مت چھینٹو تیل خدا کی قسم
کیا دل کی خوشی کو پوچھو ہو اے یارو اک ناشاد ستی

اے بادِ سحر اے موجِ صبا لے جلد ہماری آ کے خبر
نکلا ہے ہمارا کام سدا تیری ہی فقط امداد ستی

جو دیکھے ہم کو ہاتھ ملے پچھتاوے اور افسوس کرے
بتلاؤ کوئی کریں شکوہ کیا ایسے ستم ایجاد ستی

ٹھانا تو بہت اب جاویں گے ہرگز نہ کسو کے کوچے میں
ہر بار مگر مجبور رہے ہم اپنے دل ناشاد ستی

لہ نقوشِ محبت مصنفہ متین عمادی ص ۲۷

توڑا ہے وہ کب کا تقویٰ کو بھٹی میں تو اس کی گزرے ہے
سجاد وہ مسجد کی بابت کچھ پوچھ مت سجاد ستی

حسرتیں دل میں گھبراتیاں ہیں — نکلنے کی راہیں نہیں پاتیاں ہیں
تری مست آنکھوں کی یہ پتلیاں تو — تماشا قیامت کا دکھلاتیاں ہیں
ادھر بدلیاں ہیں ادھر میری آنکھیں — وہ پانی تو یہ اشک برساتیاں ہیں
خدا را بتا دیں تو ٹک ہم کو سانسیں — کہاں آتیاں ہیں کہاں جاتیاں ہیں
اسے پاس یہ حسرتیں ہیں جو میری — ترا نام سن سن کے گھبراتیاں ہیں
سرِ بزم دکھلاویں ہیں بسکہ شوخی — وہ آنکھیں جو خلوت میں شرماتیاں ہیں
امیدیں جو مہماں ہیں میرے دل میں — لہو پیتیاں ہیں جگر کھاتیاں ہیں
سنا ہوں کہ اکثر نگاہیں تمہاری — مرے قتل کے بعد پچھتاتیاں ہیں
موا جائے سجاد ہے جس کے غم میں — وہ شکلیں نگاہوں میں کیوں آتیاں ہیں[1]

---

[1] تذکرہ مسلم شعرائے بہار ص ۱۰۳ مصنفہ حکیم سید احمد اللہ ندوی

حضرت سید شاہ رکن الدین عشقؒ

ہندستان میں سلسلۂ ابوالعلائیہ کا فیضان اور اس کی مقبولیت اس طرح ہوئی کہ ہر خلفاء سے اس کا فیضان جاری و ساری ہوا۔ سلسلۂ ابوالعلائیہ کے بانی مبانی حضرت سیدنا امیر ابوالعلاؒ ہیں۔ یہ سلسلہ دراصل سلسلۂ نقشبندیہ کے اصول تعلیم کا مختصر نصاب ہے اس لیے اس سلسلے میں عشق و توحید کی تعلیم لازمی ہے۔ حضرت سیدنا ابوالعلاؒ کے مرید و خلیفہ میر سید دوست محمدؒ تھے اور یہی وہ بزرگ ہستی ہے جن کے دست حق پرست پر حضرت شاہ رکن الدین عشقؒ کے نانا حضرت شاہ محمد فرہاد دہلویؒ مرید ہوئے اور ان ہی سے اجازت و خلافت بھی پائی۔ حضرت شاہ محمد فرہاد دہلویؒ کے والد ماجد دکن کے صوبیدار ہو کر اورنگ آباد میں تھے اور اسی وجہ سے شاہ فرہاد اورنگ آباد جاتے اور حضرت میر سید دوست محمدؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اسی طرح پر عقیدت بڑھی اور ان سے مرید ہو گئے۔ اپنے پیر کے حکم کے مطابق دہلی آکر اپنا چشمۂ فیض جاری کیا۔ آپ کا وصال ۱۱۲۵ھ میں دہلی میں ہوا۔ آپ کے خلفاء میں حضرت برہان الدین خدا نماؒ اور میر اسداللہؒ دو بزرگ ہوئے۔ [۱]

حضرت شاہ رکن الدین عشقؒ حضرت شیخ محمد کریم فاروقیؒ کے صاحبزادے تھے اور اپنے عہد کے مشہور بزرگ حضرت شاہ محمد فرہاد ابوالعلائیؒ دہلوی کے نواسے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب پدری خلیفۃ المسلمین سیدنا عمر فاروقؓ سے ملتا ہے اسی اعتبار سے آپ کے والد کی نسبت فاروقی تھی۔

---

[۱] یادگار عشق مصنفہ ثاقب عظیم آبادی صفحہ ۱۵-۱۳، مطبوعہ ۱۳۴۸ھ

آپ کی ولادت باسعادت دہلی میں ۱۱۲۴ھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم دستور کے مطابق دینی اور روحانی ہوئی۔ درانی حملے کے بعد دہلی میں لوٹ مار مچی اور دہلی تباہ و برباد ہو گئی۔ یہاں کے شرفاء ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ حضرت رکن الدین عشق رحمۃ اللہ علیہ بھی درانی حملے کے بعد مرشد آباد آ گئے اور نواب میر قاسم کی رفاقت میں ہزار سوار کی افسری کے منصب پر فائز ہوئے۔ ایک عرصہ تک فوجی ملازمت کرنے کے بعد حضرت عشق عظیم آباد تشریف لائے۔ عشق حقیقی کی آگ لگی، طلب پیر کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس وقت میں حضرت منعم پاکبازؒ کی عظمت و شہرت کا چرچا عظیم آباد میں بہت تھا۔ اس عہد کے تمام صوفیائے کرام آپ کے فیضان صحبت سے فیضیاب ہو رہے تھے۔ حضرت عشق بھی آپ کی خدمت میں گئے اور آپ سے علوم روحانی کے طالب ہوئے۔ حضرت نے ان کو اپنی صحبت میں رکھ کر فیوض روحانی سے مالا مال کیا۔ مرید ہونے کی تمنا تھی۔ دراصل بچپن ہی سے اپنے نانا کے مرید و خلیفہ حضرت برہان الدین خدا نماؒ سے بھی عقیدت تھی اور ان ہی سے مرید ہونے کی تھی ایک کشمکش دل میں تھی کہ خود حضرت منعم پاکباز نے بشارت دی کہ:۔

"تمہاری عقدہ کشائی حضرت برہان الدین خدا نما قدس سرہ سے ہے"۔ آپ حضرت برہان الدین خدا نما قدس سرہ کی خدمت میں گئے اور ان کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔ آپ نے اپنی صحبت میں رکھ کر تعلیم و تلقین کی، ذکر و اشغال میں بھی مشغول کیا اور پھر آپ کو اجازت و خلافت سے نوازا اور ہدایت کی کہ منعم پاکؒ کی صحبت سے مستفیض ہوں۔ چنانچہ آپ پھر عظیم آباد تشریف لے آئے اور حضرت سے درس ارشاد لینے لگے اور آپ کے ایسے شیدائی اور فریفتہ ہو گئے کہ عظیم آباد ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ رشد و ہدایت کے لئے ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی جو پہلے شاہ گھسیٹا تکیہ کہلاتا تھا اب تکیہ عشق کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کی خانقاہ سے سلسلۂ رشد و ہدایت کو بہت فروغ ہوا خصوصاً سلسلۂ ابوالعلائیہ کا فیضان جاری و ساری ہوا۔ اور بارہویں صدی ہجری میں سلسلۂ ابوالعلائیہ کی اتنی مقبولیت اور توسیع ہوئی کہ بہار کی تمام مشہور اور قدیم خانقاہوں میں اس کا فیضان کسی نہ کسی طرح ضرور پہنچا۔ آپ کا وصال ۱۲۰۳ھ میں تکیہ شاہ عشق میں ہوا اور اسی خانقاہ کی محبوب خاک میں اپنی آخری آرام گاہ بنائی۔ آپ کا مزار مبارک مرجع خلائق ہے آپ کے شاگرد فدوی نے تاریخ رحلت لکھی ہے۔

گفت فدوی سال تاریخ وفات — ہادی ما شاہ رکن الدین عشق
۱۲۰۳

غلام حسین شورش بھی حضرت کے بڑے معتقد اور تربیت یافتہ تھے حضرت عشق ہی کی ایما پر اپنا مشہور تذکرہ "تذکرۂ شورش" لکھا ہے جس میں حضرت کے حالات اور انتخاب کلام اس طرح لکھتے ہیں:-

"حضرت شاہ رکن الدین عشق عرف مرزا گھسیٹا مد ظلہ العالی صاحب دیوان ریختہ، ساکن شاہجہان آباد، خلیفہ حضرت شاہ فرہاد نقشبندیہ قدس سرہٗ از بست و دو سال در عظیم آباد تشریف آوردہ و ترک روزگار نمودہ۔ استقامت فرمودہ و توکل را رفیق خود ساختہ، خلائق را در علم ظاہر و باطن تربیت می فرمایند خصوصاً طلبہائے علم تصوف مثل مثنوی حضرت مولوی و شرح رباعیات حضرت مولوی جامی و لمعات وغیرہ اکثر مردم می خوانند و مخلص بزرگان می مانند و سماع را دوست می دارند آنچہ انسان کامل را باید ہمہ می دانند۔ حق تعالیٰ سلامت دارد۔[۱]

چشم خلق کے گو مثل حباب آتا ہوں — عین دریا ہوں حقیقت میں بہا جاتا ہوں

حضرت عشق اردو کے بلند پایہ شاعر ہیں خصوصیت کے ساتھ صوفیانہ شاعری میں تو آپ کا منفرد رنگ اور بلند مقام ہے اور یہ حقیقت ہے کہ حضرت عشق کا اصل رنگ ان کے عارفانہ کلام میں ہے۔ عارف باللہ عشق حقیقی میں تپ کر فنائیت حاصل کرتے ہیں۔ حضرت عشق کے نزدیک عشق حقیقی کائنات کی سب سے بڑی قوت ہے اور اس کا دائرہ بہت وسیع اور لامتناہی ہے اس کی رسائی عرش تک ہے۔ حضرت کے اشعار میں اس کو دیکھئے۔

کیا زباں پر آسکے ہے راز عشق — گو کہ دل میں آتی ہے آواز عشق
وہم جن و انس سے ہے وہ پرے — عرش پر بجتا ہے یارو ساز عشق

اللہ تعالیٰ کی جلوہ گری کہاں نہیں ہے۔ ہر جگہ مظاہر خداوندی کی ہی جلوہ آرائیاں ہیں۔

عرش تا فرش کر نظر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

---

[۱] تذکرۂ شورش صفحہ ۴۳۸۔

حرم میں نام شناور میں نشاں دیکھا سوائے تیرے نہ دیکھا غرض جہاں دیکھا

اور ان اشعار میں تصوف کا رنگ اور حضرت شیخ کا آہنگ ملاحظہ کیجئے ؎

دیدہ و دل جو کرتے وا دیکھا حرم و دیر میں خدا دیکھا
اس کے دامن تلک نہ پہنچے ہم خاک میں آپ کو ملا دیکھا
آشنا تجھ سے ہو نہ ہو کوئی پر تجھے سب سے آشنا دیکھا

قلبِ انسانی جلوۂ مظہر خداوندی ہے اور اسے اسی لئے عظمت حاصل ہے۔ حضرت نے اس خیال کو اس طرح پیش کیا ہے۔ ؎

دیر و کعبہ میں کیا کروں جا کر دل میں تیرا مکان دیکھ لیا
آئینہ کو جلا جو دیتا ہے اے صبا وہ غبار ہے میرا

ذات باری میں فنا ہو کر بقا کا درجہ حاصل ہوتا ہے ؎

خودی کو بے خودی کہتے ہیں آ تو مجھ فنا فی ہو
نہ کھوتے گا جو کوئی آپ کو واصل نہ ہووے گا

ہمہ اوست یعنی وحدت الوجود کے مسلک کو اس طرح پیش کیا ہے۔ ؎

فرق آشنا ہوا تفتیشِ نظر سے معلوم بلبلا آپ کو اور تجھ کو میں دریا سمجھا

تعلیم قناعت اور توکل کو اچھوتے اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ ؎

وہ شکوہ شکایت کرے جو آپ بھی کچھ ہو عارف کی نظر میں نہ چناں ہے نہ چنیں ہے

حضرت کی ایک غزل جو عارفانہ رنگ میں ہے وہ پیشِ خدمت ہے جس سے ان کے صوفیانہ مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ ؎

احدیت کا جب ورود ہوا نورِ وحدت کا تب شہود ہوا
واحدیت ہوئی نمود اس پر خالق و خلق کا وجود ہوا
عالمِ ارواح کا ہوا پیدا شکرِ ہستی ہوا سجود ہوا
بعد اس کے مثال کا عالم اس پر اجسام پھر فزود ہوا
اتنے پردے جو ذات نے پہنے کوئی مومن کوئی یہود ہوا

نور احمد نے جب تجلی کی — سر بسر خلق کو یہ سود ہوا
عشق عاشق ہوا اسی کوں دیکھ — دل نالاں بہ رنگ عود ہوا [1]

اس کے چہرے پہ خدا جلوے یہ کیسا نور تھا — ورنہ یہ دیوانگی کب عشق کا دستور تھا
سر قدرت وحدت جو کھینچا عشق نے آنکھوں کے بیچ — جو نہ سا پھر نظر آیا وہ کوہ طور تھا
پاس آنے کو مرے بعد مسافت کچھ نہ تھی — غور کر دیکھا تو میں ہی دل سے تیرے دور تھا
لگ گیا ناگاہ اس پر یہ تیرا تیر نگاہ — دل کا شیشہ جو بغل میں ہم نے دیکھا چور تھا

دل کو تیرے دکھ دیا ہے عشق کس نے ہم سے کہہ
شوخ تھا بے باک تھا خونخوار تھا مغرور تھا

آنکھوں کو تری دیکھیں گے میخانہ کہیں گے — ہونٹوں کو جو لو چھو گے تو پیمانہ کہیں گے
وابستہ تری ذات سے رونق ہے جہاں کی — جب تو نہ ہوا خلق میں ویرانہ کہیں گے
یہ بات جو ہے آج دم نقد عزیزاں — اس عشق کو سننے ہو کل افسانہ کہیں گے [2]

---

[1] مسائل تصوف ص ۱۲۱ مصنفہ مسکین اکبرآبادی [2] یادگار عشق ص ۱۴۵ مصنفہ ثاقب عظیم آبادی

حضرت خواجہ میر دردؔ

خواجہ میر دردؔ دلی کے مشہور صوفی خانوادہ کے روشن چراغ تھے۔ ان کو اپنے خاندان سے ورثہ کے طور پر جادۂ ارشاد بھی ملا اور مسلک تصوف بھی۔ وہ صوفی باصفا بھی تھے اور صوفیانہ شاعری کے دُرِ بہا بھی۔ ان کا عہد ہندستان کے گردشِ لیل و نہار کا وہ عہد ہے جب دلی کی عزت و آبرو سرِ راہ لوٹی جا رہی تھی۔ سلطنتِ مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اس کی لَو صرف مدھم ہی نہیں ہو رہی تھی بلکہ اپنی آخری ہچکی لے رہی تھی اور اس انقلاب نے مستقل مزاج شخصیتوں کے پاؤں میں بھی لغزش پیدا کر دی۔ اپنی عزتِ نفس کے لئے ان لوگوں کو شہرِ دلی کو خیرباد کہنا پڑا۔ لیکن خواجہ میر دردؔ کے پائے استقامت کو ذرہ برابر بھی لغزش نہ ہوئی اور توکل و قناعت کو اپنا مسلک بنائے رکھا۔ ان پر کیا گزری وہ جانتے ہیں یا خدا۔ لیکن اتنی حقیقت تو ضرور ہے کہ ان کے تسلیم و رضا سے کچھ لوگوں نے سبق لیا اور ان کی اتباع و پیروی کر کے انہی کے نقشِ قدم پر رہے اور دلی کو نہ چھوڑا۔ خواجہ میر دردؔ کا صوفیانہ مسلک مجتہدانہ ہے۔ لیکن میرا موضوعِ بحث خواجہ میر دردؔ کی صوفیانہ شاعری ہے اس لئے ان حقائق سے اجتناب کرتے ہوئے موضوعِ سخن پر آتا ہوں۔

خواجہ میر دردؔ کی ولادت باسعادت ۱۱۳۳ھ میں دلی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم خاندان اور خانقاہ کے دستور کے مطابق ہوئی۔ پہلے تعلیم ظاہری ہوئی اس کے بعد تعلیم باطنی۔ شریعت، طریقت اور حقیقت سے آگاہی کے بعد ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہے۔ ۱۱۶۲ھ میں جب کہ آپ نے اپنی عمر کی انتیسویں بہار دیکھی تھی اپنے والد کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے اور مکمل طور پر لباسِ فقر پہنا۔ تصنیف و تالیف میں بھی مشغول ہوئے۔ آپ کے والد ماجد خواجہ ناصر عندلیبؔ جو اپنے وقت کے بہت مشہور اور بافیض بزرگ تھے، ان کا انتقال

۱۱۷۲ھ میں ہو گیا تو حضرت کے جانشین ہوئے اور رشد و ہدایت کی توسیع و ترویج آپ جیسی مقدس ہستی کے ذریعہ ہوتی رہی اور اس اعتبار سے آپ کی خانقاہ کی شہرت دور دور تک ہوئی۔ درد کا روحانی تعلق سلسلۂ نقشبندیہ سے جا ملتا ہے۔ اسی لئے کہ سلسلۂ نقشبندیہ کا صوفیانہ مسلک وحدت الشہود ہے اس پر تا زندگی وہ قائم رہے ہیں۔ آپ کا وصال ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں ہوا اور دہلی ہی کی خاک میں آپ آسودہ ہوئے جو مرجع خلائق ہے۔

تصوف کا گہرا اثر فارسی شاعری پر پڑا ہے اور فارسی شاعری کے زیر اثر اردو شاعری پروان چڑھی اس لئے اردو شاعری میں صوفیانہ خیالات کا در آنا لازمی تھا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس نے اردو شاعری کو منزہ و مصفا کیا۔ خواجہ میر درد اردو شاعری میں صوفی شاعر کی حیثیت سے بلند و بالا ہیں اور اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ درد کی صوفیانہ شاعری میں صرف ان کا مسلک تصوف ہی نہیں ہے بلکہ واردات قلبی، عرفان الٰہی اور حال و قال کی تمام کیفیتیں اس میں ہیں جن سے وہ گزرے۔ ان کا مشاہدہ تجرباتی ہے۔ درد کی شاعری میں جو درد و سوز و بریانی اور گداختگی ہے وہ ان کا ذاتی مشاہدہ ہے۔ وہ سالک بزرگ تھے اور سلوک و معرفت کی تمام کیفیتیں ان کے ذوق شعری میں رچی اور بسی ہیں۔ ڈاکٹر وحید اختر نے اپنی تصنیف میں اس حقیقت کو اس طرح پیش کیا ہے:-

> "درد نے جس طرح مضامین معرفت و سلوک و تصوف کو شاعری میں سمویا ہے اس کی مثال اردو شاعری میں تو کم سے کم نہیں مل سکتی۔ ان کا اردو کلام حافظ کے دیوان کی طرح سراپا انتخاب ہی نہیں بلکہ مادۂ معرفت سے بھی اسی طرح لبریز ہے۔ درد نے تصوف کے حالات و واردات کو جامۂ شعر پہناتے ہیں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ وہ کبھی اپنی زبان کو مجذوبوں اور مغضوب الحال صوفیا کی طرح آلودہ کلمات بے ادبانہ نہیں ہونے دیتے۔ یہ ضبط و احتیاط اسی لئے ہے کہ درد نے تصوف کو صرف شاعری کے لئے اختیار نہیں کیا تھا بلکہ وہ سالکان راہ حق کے قافلہ سالار بھی تھے۔" ؎

ہوں قافلہ سالار طریق عدما درد   جوں نقش قدم خلق کو میں راہ نما ہوں

سچے صوفی کی طرح انہوں نے شعر کو ذریعہ عزت و شہرت اور وسیلۂ معاش نہیں
بنایا نہ انہوں نے کبھی کسی کی ہجو کی نہ قصیدہ خوانی۔ جس کا یہ دعویٰ ہو کہ اس کا سارا کلام
نظم و نثر القائے زبانی ہے وہ ان فروعات و مکروہات میں کیونکر مبتلا ہو سکتا تھا۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ درد نے اپنے وارداتِ قلبی کے ذریعہ اردو شاعری کو تصوف کے مختلف نکات
سے روشناس کیا ہے۔ توحید و معرفت کی اصطلاح تصوف کا اہم ترین موضوع ہے۔ وہ توحید
و معرفت کے رازہائے سربستہ کو اس طرح کھولتے ہیں اور شعر کا جامہ پہناتے ہیں ؎

اس مسندِ عزت پر کہ تو جلوہ نما ہے — کیا تاب گزر ہووے تعقل کے قدم کا
بستے ہیں ترے سائے میں سب شیخ و برہمن — آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا
ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب سے — اور دل میں بھروسا ہے تو ہے تیرے کرم کا

اللہ کا جلوہ ہر جگہ نظر آتا ہے اور یہی مظہر خداوندی ہے اور وحدتِ حقیقی کے مشاہدے ؎

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا — برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
حجابِ رخِ یار تھے آپ ہی ہم — کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

معرفتِ رب تو تزکیۂ نفس اور صفائی قلب کے ذریعہ ہی حاصل ہوتی ہے۔ درد کہتے ہیں ؎

مثالِ عکس جو کوئی کہ پاک طینت ہے — جہاں صفا ہے وہیں بود و باش کرتے ہیں

صفائی قلب عشق حقیقی سے پیدا ہوتی ہے۔ جب دل کے اندر عشق حقیقی کا جذبہ ہو تو وہاں
غیراللہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ درد کہتے ہیں ؎

تو چاہے نہ چاہے مجھے کچھ کام نہیں ہے — آزاد ہوں اس سے بھی گرفتار ہوں تیرا

دنیا فانی ہے اور انقلاب پذیر ہے۔ اس پر اعتبار کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ
کہتے ہیں۔ ؎

مانند حباب آنکھ تو اے درد کھلی تھی — کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

---

[1] خواجہ میر درد تصوف اور شاعری مصنفہ ڈاکٹر وحید اختر ص ۳۱۱۔

گزروں ہوں جس خرابے یہ کہتے ہیں واں کے لوگ
ہے کوئی دن کی بات یہ گھر کھا یہ باغ تھا

سلسلۂ نقشبندیہ کی تعلیم "خلوت در انجمن" ہے یعنی وہ انجمن میں بھی رہ کر دل کو یاد الٰہی سے غافل نہ کرے۔ اس خیال کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔ ؎

عالم آب میں جو آئینہ ڈوبا ہی رہا — تو بھی دامن نہ کیا درد نے تر پانی میں

سلسلۂ نقشبندیہ کے خواجگان کی دوسری اہم اصطلاح "سفر در وطن" ہے۔ اس خیال کو درد کے اس شعر میں دیکھئے ؎

آپ سے ہم گزر گئے کب کے — کیا ہے ظاہر میں وہ سفر نہ کیا

درد کے یہاں کتنا کیف و سرور ہے اور کتنے کیف آگیں یہ اشعار ہیں۔ ان کو پڑھ کر صاحب ذوق کی الگ الگ کیفیت ہو سکتی ہے اور یہی اس کی گیرائی اور گہرائی ہے۔ ؎

یہی پیغام درد کا کہنا — گر کوئی کوئے یار میں گزرے
کون سی رات آن ملئے گا — دن بہت انتظار میں گزرے

عشق و محبت طالب تصوف کے لئے ضروری ہے میں نے اس کتاب میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے اور حسن و عشق جو لازم و ملزوم ہیں وہ بھی رنگ تغزل کی جان ہیں۔ عشق کی آگ ایک ایسی آگ ہے جو جلا کر خاکستر نہیں کرتی ہے بلکہ لذت بخشتی ہے اور اس میں ایسا سوز ہوتا ہے جس میں لذت و سرور ہے اور وہی عاشق کے لئے سرمایۂ حیات ہے۔ عاشق رات دن مختلف کیفیات سے گزرتا ہے۔ درد کے اشعار میں اس کیفیت کو دیکھئے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ؎

حال مجھ غمزدے کا جس تس نے — جب سنا ہوگا رو دیا ہوگا
دل کے پھر زخم تازے ہوتے ہیں — کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا
یک بیک نام لے اٹھا میرا — جی میں کیا اس کے آگیا ہوگا

درد کے سارے اشعار تصوف کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں وہ شاعر تصوف نہیں بلکہ صوفی شاعر ہیں۔ انہوں نے تصوف کو فنی اور علمی اعتبار سے نہیں دیکھا ہے بلکہ عملی اعتبار سے اس

پر عمل کیا ہے اور سلوک کی منزلوں سے گزر کر اور فنا ہو کر بقا کی راہ لی ہے۔ حافظ نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

درد اپنے صوفیانہ افکار اور ندرتِ خیال کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ آپ کی غزلوں میں طریقت و حقیقت کے مختلف رموز ہائے سربستہ ہیں جو شانِ غزل کو دوبالا کرتے ہیں۔ ؎

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں — دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں
مٹ جائیں ایک دم میں یہ کثرت نمائیاں — گر آئینے کے سامنے ہم آ کے ہو کریں
تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جا ابھی — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدانِ شہر — اے درد آ کے بیعتِ دستِ سبو کریں[1]

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
ایک بیں درویش ہوں دیا ہی وحشت — زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے
شمع کے مانند ہم اس بزم میں — چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب — کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے[2]

ہستی ہے جب تک ہم ہیں اسی اضطراب میں — جوں موج آ پھنسے ہیں عجب پیچ و تاب میں
نے خانۂ خدا ہے نہ ہے یہ بتوں کا گھر — رہتا ہے کون اس دلِ خانہ خراب میں
آئینۂ عدم ہی میں ہستی ہے جلوہ گر — ہے موج زن تمام یہ دریا حباب میں
غافل جہاں کی دید کو مفت نظر سمجھ — پھر دیکھنا نہیں ہے اس عالم کو خواب میں
ہر جزو کو کل کے ساتھ بمعنی ہے اتصال — دریا سے دور جدا ہے پہ ہے غرق آب میں
پیری نے ملکِ تن کو اجاڑا وگرنہ یاں — تھا بند و بست اور ہی عہدِ شباب میں
میں اور درد مجھ سے خریداریٔ بتاں — ہے ایک دل بساط میں سو کس حساب میں

---

[1] تذکرۂ شورش ص ۲۳۲ مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی [2] خواجہ میر درد تصوف اور شاعری ص ۱۰۸۔

حضرت آیت اللہ جوہریؒ

آپ کا اسم شریف آیت اللہ اور تخلص جوہری ہے۔ آپ حضرت مولینا شاہ محمد مخدومؒ کے فرزند و جانشین ہیں۔ اپنے والد ماجد سے معمول کے مطابق کتب درسی پڑھی پھر اپنے چچا ملا محمد وحید الحقؒ سے حدیث و فقہ پڑھی۔ تحصیلِ علوم ظاہری کے بعد علوم باطنی کی تکمیل میں مشغول ہو گئے۔ اپنے والد حضرت مخدومؒ سے سلسلۂ قادریہ میں مرید ہوئے۔ ۱۱۴۳ھ میں اپنے والد کے وصال کے بعد مسند سجادگی پر بیٹھے۔

آپ کو فن شاعری سے کافی شغف تھا۔ فارسی میں شعر کہتے تھے اور اس میں شورش تخلص تھا لیکن جب اردو میں شاعری کرنے لگے تو اس کا تخلص جوہری رکھا۔ اردو کے شاعر کی حیثیت سے آپ مشہور ہو چکے تھے اس لئے کہ تذکرۂ شورش میں آپ کا نمونۂ کلام کافی درج ہے۔ تذکرۂ شورش میں ہے کہ :-

> "شاہ آیت اللہ سلمہ اللہ جوہری تخلص۔ فرزند شاہ مخدوم قدس سرہٗ و خویش حضرت شاہ مجیب اللہ مدظلہ العالی، ساکن قصبہ پھلواری۔ بزرگی ہر دو بزرگاں مشہور و معروف است۔ کسیکہ با فقیر راہ و ربطا می دارد، می داند و مرید نیز از والد خود اند چنانچہ فرمودہ
>
> اور سے میں طلبی ہونے کا نہیں اے جوہری ۔۔۔ وارثِ حال نبی مخدوم ہے مرشد مرا
>
> و لطفِ دیگر دریں شعر اینست کہ از حضرت شاہ محمد وارث محمد آباد بنارسی قدس سرہٗ نیز خاندان ایشاں را فیض است۔ بہر حال گاہے شعر فارسی و گاہے شعر ریختہ می فرمائید۔ با فقیر از مدت مربوط اند و توجہ کریمانہ الحال می فرمائید۔

حق تعالیٰ خوش و خرم بر مسندِ ہدایت و ارشاد نگاہ دارد۔[1]

جو ہرؔ کی صوفیانہ مذاق رکھتے تھے اس لئے تصوف کی ہما ہمی اور عشق حقیقی کی گرمی ان کے کلام میں ہے۔ اس قبیل کے اشعار مندرجہ ذیل ہیں: ؎

تاقیامت بند ہونے کا نہیں ہے بابِ فیض
عقدۂ دل ناخنِ دستِ پیمبر سے کھلا

عشق پر زور نے کیا کیا نہ کیا خانہ خراب
کوہ کن کو ہے ہوا قیس ہوا صحرائی

جی میں آتا ہے کہ دل سب سے جدا کر لیجئے
شوخ اس بت کے تئیں اپنا خدا کر لیجئے

---

[1] تذکرۂ شورش ص ۱۴۷ مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی

حضرت شاہ نورالحق طپاں پھلواروی ؒ

خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سٹی بھی اپنے علم وفضل اور رشد و ہدایت کی وجہ سے صوبہ بہار میں مشہور و معروف ہے ۔ یہ حضرت عماد الدین قلندر ؒ اور ان کے صاحبزادے حضرت غلام نقشبند سجاد ؒ کے داماد اور حضرت تاج العارفین پیر مجیب اللہ پھلواروی کے پوتے حضرت شاہ نورالحق طپاں پھلواروی ؒ کی خانقاہ ہے ۔

حضرت شاہ نورالحق طپاں ، تاج العارفین حضرت پیر مجیب اللہ پھلواروی ؒ کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا شاہ عبدالحق ؒ کے بڑے صاحبزادے ہیں اور حضرت خواجہ عماد الدین ؒ کے صاحبزادے حضرت غلام نقشبند سجاد ؒ کے داماد تھے آپ کی ولادت باسعادت ماہ جمادی الاول ۱۱۵۶ھ میں پھلواری شریف ضلع پٹنہ میں ہوئی ۔ درسی کتابیں اس عہد کے یگانہ روزگار عالم ملا وحید الحق ابدال سے پڑھی ۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد علوم روحانی کا شغف ہوا اور حلقہ ارادت میں داخل ہونے کی تڑپ نے بھی زور کیا ۔ بالآخر آپ حضرت پیر مجیب اللہ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے ۔ ریاضت و مجاہدہ میں مشغول کئے گئے اور جب حضرت تاج العارفین نے مرید کو بامراد دیکھا تو اجازت وخلافت سے نوازا ۔

چونکہ آپ خواجہ عماد الدین قلندر کے صاحبزادے اور حضرت غلام نقشبند سجاد کے داماد تھے ۔ اس لئے جب حضرت غلام نقشبند سجاد کا وصال ۱۱۷۲ھ میں ہوا تو حضرت پیر مجیب اللہ نے اپنے پیر و مرشد حضرت عماد الدین قلندر کی گدی پر آپ ہی کو صاحب سجادہ بنایا ۔ اس طرح آپ سے حضرت عماد الدین قلندر کا بھی فیضان جاری ہوا اور حضرت پیر مجیب اللہ قادری کا بھی ۔ آپ کی خانقاہ عمادیہ پھلواری سے رشد و ہدایت کا فیضان جاری تھا کہ کچھ ناموافق حالات کے باعث

آپ کو ضعیف العمری میں اپنا مولد و مسکن پھلواری چھوڑنا پڑا اور عظیم آباد منتقل ہونا پڑا۔ چنانچہ آپ کی خانقاہ عمادیہ پھلواری سے منگل تالاب منتقل ہو گئی اور ہنوز شاد و آباد ہے۔[1]

آپ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے صاحبزادے حضرت شاہ ظہور الحق طپاں کو اجازت و خلافت دے کر ۱۲۰۰ھ میں اپنی مسند سجادگی پر بٹھا دیا اور خود گوشہ نشین ہو گئے۔ ۱۴ شعبان المعظم ۱۲۳۲ھ کو خانقاہ عمادیہ منگل تالاب میں وصال فرمایا۔ آپ کا جنازہ پھلواری شریف لایا گیا اور لعل میاں کی درگاہ میں سپرد خاک کئے گئے۔

بچپن سے شاعری کا ذوق تھا بلکہ فطری لگاؤ تھا۔ طپاں تخلص فرماتے تھے۔ آپ نے کس کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اس کا ابھی تک پتہ نہیں چلتا ہے۔ فارسی اور اردو دونوں میں ذوق فرماتے تھے اور صاحب دیوان تھے۔ آپ کی فارسی غزلوں کے تین دیوان خانقاہ عمادیہ منگل تالاب میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اردو مراثی کا ایک ضخیم بیاض بھی خانقاہ مذکور میں موجود ہے البتہ حضرت کی اردو غزلیں محفوظ نہ رہ سکیں ویسے کچھ مشہور غزلیں آپ سے منسوب ہیں۔ خاص کر یہ دو اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ ؎

اپنی کملی میں جب مگن ہیں طپاں
کام کیا شال سے دوشالے سے

تمنا ہے کہ ہر دم تیری صورت دیکھتے رہتے
تو ہوتا سامنے ہم تا قیامت دیکھتے رہتے

حضرت طپاں فطری اور صوفی شاعر تھے۔ ان کے فارسی اشعار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا کلام تصوف کے حقائق و معارف سے پُر ہے۔ نقوشِ صبیح میں تحریر ہے:-

"عنفوانِ شباب میں آپ کا کلام کسی نے علی حزیںؔ کو بنارس میں دکھایا تھا۔ انہوں نے غزلوں کے ان اوراق پر یہ جملہ تحریر کر دیا تھا" ہمانا کہ کلام خوب است و برخے ازاں مرغوب، اما بوئے پیرزادگی می آید"۔ شاید کہ ان کو پیرزادگی کا گمان اس لئے ہوا ہو کہ کلام میں تصوف کا رنگ گہرا تھا۔ آپ کے متعدد شاگرد تھے۔ ان میں ممتاز

---

[1] نقوشِ صبیح صد ۲۳ مرتبہ متین عمادی۔

اور صاحب دیوان شاگردوں میں فرد اول دیا۔ حضرت شاہ ابوالحسن فردؔ کا نام آتا ہے“۔[1]

حضرت طپاںؔ کی مشہور غزل ہے ؎

تمنا ہے کہ ہر دم تیری صورت دیکھتے رہتے ۔۔۔ تو ہوتا سامنے ہم تا قیامت دیکھتے رہتے
کیا سجدے میں لا کر کس نے مجھکو کشتۂ حیرت ۔۔۔ جو جاتے بتکدے میں حق کی قدرت دیکھتے رہتے
غلام ان کا ہوں پھر کیونکر نہ مجھکو بخش دیتے وہ ۔۔۔ وہ کن آنکھوں سے بیٹھے میری ذلت دیکھتے رہتے

طپاںؔ ہم خود نہ ہوتے بیچ میں اور انکی آنکھوں سے
لگانے ٹکٹکی وہ پیاری صورت دیکھتے رہتے

---

[1] نقوش صبیح ص۲۳ مرتبہ حسنین عمادی، و یادگار عشق ص۵ مرتبہ ثاقب عظیم آبادی ۔

حضرت شاہ نیاز احمد بریلویؒ

مرشدِ کامل، پیشوائے طریقت حضرت نیاز بریلویؒ سلسلۂ چشتیہ کے اکابر بزرگوں میں سے ہیں۔ حضرت شاہ فخر الدین دہلویؒ کے اکمل ترین خلفا میں آپ کا شمار ہوتا ہے اور رشد و ہدایت کے علاوہ عشق حقیقی کی آگ نے آپ کے دل میں سوز و گداز پیدا کر دیا جس نے آپ کے جذبات و واردات کو دو آتشہ بنا دیا اور یہ دو آتشہ اردو شاعری کی شکل میں جلوہ پذیر ہوتے رہے اور صوفی شاعر کی حیثیت سے آپ امتیازی خصوصیت کے حامل ہیں۔

حضرت شاہ نیاز احمدؒ ۱۱۷۳ھ میں بمقام سرہند پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد حکیم شاہ رحمت اللہ صاحبؒ کا سایۂ رحمت بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ نے نہ صرف آپ کی پرورش پر بلکہ تعلیم و تربیت پر بھی خاص توجہ کی۔ حصول تعلیم کے لئے آپ دہلی تشریف لائے اور دہلی میں حضرت شاہ فخر الدین دہلویؒ کی خدمت میں علوم ظاہری کی تکمیل کے لئے حاضر ہوئے۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد آپ کے دستِ حق پرست پر مرید ہو گئے اور علوم ظاہری سے فراغت پا کر علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کے بعد حضرت شاہ فخر الدین دہلویؒ نے آپ کو اجازت و خلافت سے بھی سرفراز فرمایا اور بریلی میں رشد و ہدایت کی ہدایت کی۔

حضرت کافی دنوں تک دہلی میں رہ کر درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے چنانچہ مصحفی جیسا شاعر بھی آپ کا شاگرد رہا ہے اور وہ اپنے تذکرہ ”ریاض الفصحا“ میں خود لکھتا ہے کہ:

”چند روز میرزا ان ہمہ ذیشان در شاہ جہاں آباد خواندہ بود“ [1]

---

[1] تذکرہ ریاض الفصحا مصنفہ مصحفی۔

حقیقت یہ ہے کہ سلسلۂ چشتیہ کو جو فروغ حضرت شاہ نیاز صاحبؒ سے ہوا اور رشد و ہدایت کی توسیع جو آپ کے ذریعہ ہوئی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ حضرت شاہ فخرالدین دہلویؒ نے بریلی میں اقامت کی ہدایت فرمائی تھی۔ اس لئے پیر کی ہدایت کے مطابق دہلی چھوڑ کر بریلی میں خانقاہ قائم کی اور اسی خانقاہ سے رشد و ہدایت جاری و ساری کیا۔ مصنف تاریخ مشائخِ چشت فرماتے ہیں کہ:۔

"آپ کی لیاقتِ استعداد اور سعیٔ پیہم سے پیر بہت متاثر ہوئے اور اپنا خلیفۂ راشد مقرر کیا اور بریلی میں اقامت کی ہدایت فرمائی۔ بریلی پہنچ کر شاہ نیاز احمد صاحب نے اپنی خانقاہ قائم کی جو بہت جلد بقول مولانا غلام سرور "معدنِ فیوضِ ربانی" اور "مطلعِ انوارِ سبحانی" بن گئی جگہ جگہ سے لوگ آپ کی صحبت سے فیوض حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی میں چشتیہ نظامیہ سلسلے کو ہندستان میں جو کچھ فروغ ہوا وہ مولانا شاہ فخرالدین دہلویؒ کے مریدوں کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ شاہ نور محمد صاحب نے پنجاب میں اور شاہ نیاز احمد صاحب نے یوپی میں سلسلہ کو خوب پروان چڑھایا۔" [1]

رشد و ہدایت کا یہ ستارہ اپنے فیوضِ علمی و روحانی سے ایک جہاں کو سیراب کر کے سنہ ۱۲۵۰ھ مطابق سنہ ۱۸۳۴ء کو غروب ہو گیا اور ان کے بعد ان کے خلیفۂ اکبر حضرت تاج الاولیاء شاہ نظام الدین صاحبؒ سجادہ نشین ہوئے۔

حضرت شاہ نیازؒ کا شمار اردو کے ممتاز ترین صوفی شعراء میں ہوتا ہے۔ چنانچہ صاحب خزینۃ الاصفیاء نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ:۔

"حضرت شاہ دل آگاہ بہ شعر رغبت تمام داشت و اشعار آب دار متضمن حقائق و معارف گفتے چنانچہ دیوان نیاز کہ از تصانیف آنحضرت است بسیار مرغوب و مطبوع طبع جماعت اصفیاء است۔" [2]

---

[1] تاریخ مشائخ چشت مصنفہ خلیق احمد نظامی ص ۶۲۳ [2] خزینۃ الاصفیاء جلد اول مصنفہ غلام سرور لاہوری ص

(ترجمہ، حضرت شاہ صاحب جو حقیقت شناس تھے شعر کی جانب بڑی رغبت رکھتے تھے اور نہایت آبدار شعر کہتے تھے جن میں حقائق و معارف کا ذکر ہوتا تھا۔ چنانچہ دیوانِ نیاز صوفیوں کی جماعت میں بے حد مرغوب ہے۔)

حضرت شاہ صاحب کا دل سوز و گداز سے معمور تھا عشق حقیقی کی لپیٹ سے دل بریاں تھا اس لیے اس کے اظہار کے ذریعہ کے لیے شعر و شاعری کی طرف رغبت کی۔ اردو شاعری کو انہوں نے تصوف کے پاکیزہ خیالات سے منزہ کیا اور تصوف کے نہایت باریک نکات کو جاذبیت اور دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس کے اندر نفاست و سلاست کا خاص اہتمام ہے حضرت نیاز نے فکر رسا پائی تھی جس کے بارے میں وہ خود فرماتے ہیں ؎

رکھتے ہیں نیاز یہ اہلِ دل تیرے شعر سننے کا اشتیاق

غزل ایک دوسری اور کہہ تجھے حق نے فکرِ رسا دیا ہے

حضرت نیاز نہایت بلند خیالات کو بھی انتہائی سادگی اور دلکشی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ ؎

کروں کیا بیاں میں ہم نشیں اثر اس کے لطف نگاہ کا

کہ تعینات کی قید سے مجھے ایک دم نے چھڑا دیا

اب اس شعر کی داد دیجیے جو زبان زد خاص و عام ہے اور ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے ؎

جبھی جا کے مکتبِ عشق میں سبقِ مقام فنا لیا

جو لکھا پڑھا تھا نیاز نے سو وہ صاف دل سے بھلا دیا

اور اب اس شعر پر بھی غور کیجیے ؎

غمِ جدائی کو ہم جانیں یا خدا جانے   بلاکشوں پہ جو گزری تری بلا جانے

شیفتہ نے "گلشن بے خار" میں ان کے یہ اشعار منتخب کیے ہیں ؎

وہ جو نقش پا کی طرح رہی تھی نمود اپنے وجود کی

سو کشش نے دامن ناز کی اسے بھی زمیں سے مٹا دیا

صبر و قرار و شکیب طاقت و تاب و تواں — اور سب چل بسے رہ گئی ایک جان تو
ہجر کی جو مصیبتیں عرض کیں اسکے روبرو — ناز و ادا سے مسکرا کہنے لگا جو ہو سو ہو[1]

شاہ نیاز صاحبؒ کے کلام کا اصل موضوع وحدت الوجود ہے۔ وہ ہمہ اوست کے قائل تھے۔ انہوں نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں اس نظریے کی اشاعت میں کافی سرگرمی دکھلائی یہی وجہ ہے کہ آپ کا کلام اس سے لبریز ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ـ

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا — از ماہ تا بہ ماہی سب ہے ظہور تیرا
وحدت کے ہیں یہ جلوے نقش و نگار کثرت — گر ہے معرفت کو پاوے شعور تیرا
نیرنگیوں سے یار کی حیراں نہ ہو جیو — ہر رنگ میں اسی کو تو دیدار دیکھنا

جب دیدۂ بینا میں ہم سارے کم و بسیار ایک
کثرت نمایاں اتنی ہو جتنا کرے تکرار ایک

حضرت شاہ صاحب وحدت ادیان کے بھی قائل تھے۔ وہ فرماتے ہیں۔ ـ

یہ سب ادیان و ملل ہیں شاخ ہائے یک درخت
ایک ہی جڑ سے ہیں نکلی ڈالیاں سب پھوٹ پھوٹ

ہفتاد و دو ملت کے جھگڑے کو اس شعر میں اس طرح ختم کیا ہے ـ

گر بادۂ توحید پیش اہل مقارب — ہفتاد و دو ملت کی ہو تکرار فراموش

اور شیخ و برہمن کی خبر اس طرح لی ہے۔ ـ

جو رب الحرم ہے صنم بھی وہی ہے — حرم دیر میں ایک ساں دیکھتا ہوں
اسے برہمن اور اسے شیخ مانیں — یہ آپس کا جھگڑا یہاں دیکھتا ہوں

عشق حقیقی کا اظہار تمام صوفی شعرا نے کیا ہے۔ حضرت نیاز کے یہاں اس کا انداز نرالا ہے اس لئے کہ آپ اہل دل تھے۔ عشق الٰہی کا جذبہ موجزن تھا۔ عشق کے بندے تھے۔ عشق کی دنیا میں رہتے تھے اس لئے وہ فرماتے ہیں کہ ـ

---

[1] گلشن بے خار، مصنفہ مصطفیٰ خاں شیفتہ ص ۲۳۳

جونہی آمد آمد عشق کا مجھے دل نے مژدہ سنایا
خرد و حواس و شکیب نے وہیں کوس کوچ بجا دیا

اور عشق کا احسان ملاحظہ کیجئے ؎

کہاں تک کہوں لطف و احسانِ عشق — د جوں جوں گھٹا میں بڑھایا مجھے
یہاں تک دیا مجھ کو حسنِ عروج — کہ بندے سے مولا بنایا مجھے

جذباتِ عشق سے حضرت کا سینہ سپیدہ ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ؎

جوش زن ہے عشق کی شاب خمِ دل میں نیاز
گہہ ابل کر وہ گرے خم سے نکلے ہو ٹپھوٹ

کہیں عاشق نیاز کی صورت — سینۂ بریاں اور دل جلا دیکھا

اب حضرت کی مشہور غزل ملاحظہ فرمائیے ؎

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا — از ماہ تا بہ ماہی سب ہے ظہور تیرا
اسرارِ احمدی سے آگاہ ہو سو جانے — تو نور ہر شجر ہے ہر سنگ طور تیرا
ہر آنکھ تک رہی ہے تیرے ہی منہ کو پیارے — ہر کان میں ہوں پاتا معمور شور تیرا
جب جی میں یہ سمائی جو کچھ کہ ہے سو تو ہے — پھر دل سے دور کب ہو قرب و حضور تیرا
بھاتا نہیں ہے واعظ جز دیدِ حق مجھے کچھ — تجھ کو رہے مبارک حور و قصور تیرا
وحدت کے میں جلوے نقش و نگارِ کثرت — گر سرِ معرفت کو پاوے شعور تیرا
گر حرف بے نیازی سرزد نیاز سے ہو — پتلے میں خاک کے ہے پیارے غرور تیرا

معرفت میں ڈوبی ہوئی یہ غزل پڑھیئے اور سر دھنیئے ؎

نیستی ہستی ہے یارو اور ہستی کچھ نہیں — بیخودی مستی ہے یارو اور مستی کچھ نہیں
لامکاں کی منزلت پاتا ہے کب کونِ مکاں — "ہو" کے ویرانے کے آگے "بستی" کچھ نہیں
کچھ نہیں سب کچھ ہے یارو اور سب کچھ کچھ نہیں — غیر اسکے معنی رمزِ الستی کچھ نہیں
یہ جو کچھ ہونا جسے کہتے ہیں پستی ہے میاں — فقر میں پستی یہی ہے اور پستی کچھ نہیں
بندگی اور حق پرستی کچھ نہ ہوتا ہے نیاز — کچھ نہ ہونے کے سوا اور حق پرستی کچھ نہیں

حضرت شاہ تراب علی قلندرؒ

حضرت شاہ تراب علی قلندرؒ تصوف کی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں۔ صوفی شاعر کی حیثیت سے آپ کا منفرد مقام ہے۔ آپ اپنے والد و مرشد مولانا شاہ محمد کاظم قلندر قدس سرہٗ کے خلف اکبر اور جانشین تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۱۸۱ھ میں ہوئی۔ کتب فارسی و عربی ملا قدرت اللہ بلگرامی اور مولوی معین الدین بنگالی سے پڑھیں اور مزید تعلیم ملا حمید الدین کاکوروی اور قاضی القضاۃ مولوی نجم الدین علی خاں بہادر سے حاصل کیں۔ علم عروض پر بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔

علم دینی ہی کے زمانے سے علم روحانی کے حصول کا جذبہ کارفرما تھا اور انہوں نے بڑی ریاضت و مجاہدہ کے بعد اسے حاصل کیا جیسا کہ تذکرہ "مشاہیرِ کاکوروی" میں تحریر ہے:

"زمانہ تحصیلِ علوم رسمیہ سے علوم صوفیہ اور حقائق و معارف کی طرف خاص طور سے میلانِ خاطر تھا اور چونکہ اپنے حضرت والد ماجد قدس سرہٗ کی صحبت بابرکت حاصل تھی لہٰذا اور شوق و شغف بڑھتا گیا۔ تیئس سال کامل آپ نے انہی کی خدمت میں رہ کر مقاماتِ سلوک پر عبور حاصل کیا اور ریاضات اور مجاہدات موافقِ معمول اربابِ طریقت کئے اور خلوت اور چلّہ کشی اور زکوٰۃ ادعیہ و اسماء اللہ ادا کیں اور کوئی دقیقہ ان کی متابعت میں فروگذاشت نہیں کیا۔

بیعت آپ کو سلسلہ عالیہ قادریہ میں حضرت میں ہو شاہ مسعود علی قلندرؒ خلف و خلیفہ و جانشین شاہ باسط علی قلندر الٰہ آبادی تھی اور اجازت و خلافت کبریٰ مع الباس اپنے پیر و مرشد نیز والد ماجد دونوں سے حاصل تھیں۔

اس کے سوا اجازت و خلافت سلاسل سبعہ حضرت شاہ خدا بخش قلندر برادر زادہ حضرت شاہ عبدالرحمٰن قلندر ربانی خلف و خلیفہ حضرت شاہ الہدیا احمد قلندر لاہر پوری سے بھی تھی اور خواجہ حسن مودود چشتی لکھنوی سے اجازت و خلافت سلسلہ قادریہ و چشتیہ نظامیہ حاصل تھی۔ پچپن سال اپنے والد کے سجادہ نشین رہے اور فرائض سجادہ نشینی نہایت خیر و خوبی و عمدگی سے انجام دیئے اور ایک عالم کو اپنے فیوض و برکات سے مالا مال کیا۔

تصانیف آپ نے بہت بہتر اور نفیس فرمائے جو طبع ہو کر بہت مقبول ہوئے۔ درج ذیل ہیں۔ (۱) اصول المقصود مطبوعہ (۲) مجمع الفوائد غیر مطبوعہ (۳) فتح الکنوز مطبوعہ (۴) مقالات صوفیہ مطبوعہ (۵) مطالب رشیدی مطبوعہ (۶) شرح اثبات الوسائط مطبوعہ (۷) مجاہدات الاولیاء غیر مطبوعہ (۸) اسناد المشیخت غیر مطبوعہ (۹) تعلیم الاسماء (۱۰) کشف المتواری فی حال نظام الدین القاری غیر مطبوعہ۔

قسام ازل نے آپ کو شعر و سخن کا بھی شوق دیا تھا۔ ابتدا میں شہید تخلص فرماتے تھے پھر تراب کر دیا تھا۔ کلام نظم فارسی و اردو و ہندی تینوں زبانوں میں موجود ہے۔ کلیات اردو میں دیوان اور مثنوی عاشق و صنم و شجرات منظوم اور ٹھمریاں ہیں۔ اور کلیات فارسی میں دیوان اور مثنوی اصل المعارف اور ترجیع بند اور مخمس کریما اور تواریخ ہیں۔ دونوں کلیات طبع ہو کر بہت مقبول ہوئے[۱]۔

آپ کے کلام میں صوفیانہ عناصر غالب ہیں آپ نے صوفیانہ خیالات کو اپنے اشعار میں بڑے ہی حسن و خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ آپ نے اسی وجہ سے صوفی شعرا میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے۔ نمونہ کلام سے اس کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کے اشعار میں وحدت الوجود بھی ہے اور وحدت و ادب کی جھلک بھی۔ آپ نے ایک غزل میں ان تمام حقائق کو کیسے کہتے ہیں لکھا

---

[۱] تذکرہ مشاہیر کاکوری مصنفہ محمد علی حیدر رحمۃ اللہ علیہ کاکوروی۔ مطبع اصح المطابع، لکھنؤ مطبوعہ سنہ ۱۹۲۷ء صفحہ ۷۰۔

دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

کہنا بعید ہے یہ گھر ہے تو در در تیرا — ہے جلوہ گہ مراد دل جو کوہِ طور تیرا
کہتا ہے کون تجھکو پنہاں عیاں ہے یوں تو — عاشق کو ہے میسر ہر دم حضور تیرا
تیری چمک سے پیارے روشن ہیں سب ستارے — خورشید میں پڑا ہے اک ذرّہ نور تیرا
بے کشتیٔ شریعت دریائے معرفت میں — بے جا ہے اے موحّد کرنا عبور تیرا
ہرگز تراب حق کو پہچانتا نہ واللہ — کا ظلم اگر نہ ہوتا جگ میں ظہور تیرا

مندرجہ ذیل غزلیں بھی آپ کی صوفیانہ کلام کی غمازی کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

نشاں اس کا کسی سے کب بیاں ہو — وہی پاوے نشاں جو بے نشاں ہو
منزّہ وہ تو ہے کون و مکاں سے — مکاں اس کا کہاں جو لامکاں ہو
کوئی جا گہ نہیں ہو اس سے خالی — زمیں ہو عرش ہو یا آسماں ہو
سوا اس کے نہیں کوئی جہاں میں — تلاش اس کی کروں یارو جہاں ہو
ٹھکانا اس کا میں کیوں کر بتاؤں — خدا جانے وہ ہرجائی کہاں ہو
تراب استاد سے معلوم کر لو — طریقِ معرفت گر قدر داں ہو

دلیل کارواں بانگِ جرس ہے — گواہ درد و غم اک نالہ بس ہے
بت ظالم نہیں سنتا کسی کی — غریبوں کا خدا فریاد رس ہے
گلستاں عیش باغ بلبلاں ہو — ہمیں تو یار بن کنج قفس ہے
نظر پڑتے ہیں لالے داغ کی شکل — ہمیں سبزہ بجائے خار و خس ہے

عبث ہو آرزو دنیا و دیں کی
تراب اللہ بس باقی ہوس ہے

آپ کا وصال ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۸ء کو ۴۹ سال کی عمر میں ہوا۔

حضرت شاہ ابوالحسن فرد پھلواروی

حضرت شاہ ابوالحسن فرد پھلواروی حضرت پیر مجیب اللہ قادری پھلواروی کے پوتے اور شاہ محمد نعمت اللہ قادری پھلواروی کے خلفِ اکبر، جانشین اور سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ تھے۔ آپ کا خطاب فردالاولیاء ہے اسی وجہ سے آپ نے اپنا تخلص فرد رکھا۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۱۹۶ھ کو پھلواری شریف میں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم والد ہی سے ہوئی۔ اس کے بعد آپ کی تکمیل حضرت سید العلما مولانا احمدی صاحب سے ہوئی جو اپنے عہد کے جید عالم تھے۔ آپ کی تمنا تھی کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی درسِ حدیث لیں لیکن خانقاہ مجیبیہ کی خدمت کے باعث یہ تمنا حسرت بن کر رہ گئی۔ ۱۲۴۷ھ میں آپ کے والد کا انتقال ہوا تو مسند سجادگی پر جلوہ افروز ہو کر خدمتِ خلق میں مشغول ہوئے۔ آخر ۲۱ محرم الحرام ۱۲۶۵ھ کو اپنے معبود حقیقی سے جا ملے اور اپنے آبائی مدفن میں مدفون ہوئے۔

آپ فطری شاعر تھے اس لئے بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق رہا۔ آپ اپنے چچا شاہ جان محمد سے تو لحق طبیا ... مشورہ سخن لیتے رہے۔ خداداد ذہانت بھی اس لئے سعدی، خسرو، حافظ، جامی اور عرفی کے کلام کا مطالعہ کر کے ان کے انداز شاعری کو بھی اخذ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت فرد پھلواروی فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ بعض غزلوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ شیرازی کا رنگ غالب ہے۔ بلکہ حافظ کے کلام کا شبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے آپ کے فارسی کلام کا مجموعہ کلیاتِ فرد کے نام سے ۱۲۶۹ھ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے جو بہت ہی مشہور و مقبول ہوا۔ اس میں غزلیں، رباعیات، قطعات اور مثنویاں بھی ہیں۔

آپ کا شمار اساتذہ وقت میں ہوتا تھا۔ صرف فارسی شاعری ہی پر آپ کو کمال حاصل نہیں تھا بلکہ اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے اور اس کے بھی نادر الکلام شاعر تھے۔ زبان میں صفائی بھی ہے اور نازک خیالی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا احمد اللہ ندوی لکھتے ہیں کہ:

"راقم کہتا ہے کہ حضرت فرد کی اردو شاعری بھی اپنی ندرت خیال، بندش الفاظ اور اپنے اسلوب بیان کے لحاظ سے لاجواب ہوتی تھیں اور آپ کا اردو کلام صوبہ بہار میں اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتا تھا۔" [۱]

آپ کا اردو کلام کمیاب اور مختصر ہے لیکن جو کچھ بھی ہے اس میں تصوف کی جلوہ گری ہے اور تغزل کا رنگ بھی۔ آپ کے یہ دو اشعار بہت مشہور ہیں، ملاحظہ ہو ؎

دل جسے کہتے تھے وہ ایک آبلہ تھا بہہ گیا   نام کو اب زخم سا داغ نمایاں رہ گیا
فرد کی کیا خوب حالت عشق میں پہنچی ہے اب   جس کے جو کچھ جی میں آیا منہ پہ آکے کہہ گیا

فرد کی مندرجہ ذیل غزل میں ان کے صوفیانہ خیالات کی اثر آفرینی دیکھئے ؎

جسے تم غیر سمجھے ہو اسے ہم یار کہتے ہیں   جہاں کو ہم سراسر جلوۂ دلدار کہتے ہیں
نہ ہو جس گل میں تیری بو اسے ہم خار کہتے ہیں   جہاں تو جلوہ گر ہووے اسے گلزار کہتے ہیں
سند منصور کی ہے یہ ہمیں راہ محبت میں   سر دار آتے جس کا سر اسے سردار کہتے ہیں
اگر دل صاف ہے کب کوئی ہے دیدار کا مانع   جو ہووے سد راہ یار اسے دیوار کہتے ہیں

نہیں ہے اپنا شیوہ شاعری کا فرد پر ہم نے
کیا نذر نیاز ان کی جو یہ اشعار کہتے ہیں

آپ کا وصال ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں ہوا اور پھلواری شریف میں مدفون ہوئے۔

---

[۱] تذکرہ مسلم شعرائے بہار حصہ سوم مصنفہ احمد اللہ ندوی ص ۲۱۷

حضرت سیّد شاہ امیر الدین وجدؔ

بہار شریف دینی اور روحانی اعتبار سے متبرک اور مقدس نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس سرزمین میں اکابر اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کی خانقاہ جہاں پناہ رشد و ہدایت اور تصنیف و تالیف کیلئے مشہور و معروف تھی۔ اسی سرزمین میں حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کی ذات مقدس رشد و ہدایت کے لئے مشغول تھا رہی اور آپ ہی کی نظرِ خاص اور تعلیم روحانی سے حضرات بلخیہ نے بھی تصنیف و تالیف کی حیثیت سے جماعتِ صوفیا میں اپنا خاص مقام بنایا۔ حضرت امیر الدین وجدؔ حضرت مخدوم جہاں کی اولاد میں سے ایک ہیں اور آپ ہی کی خانقاہ میں رشد و ہدایت کے فیوض و برکات سے ایک جہاں کو فیضیاب کرتے رہے۔ آپ حضرت مخدوم جہاں کی پوتی بی بی بارکہ کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ حضرت شاہ ولی اللہ بن علیم الدین کے صاحبزادے تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۹ء میں خانقاہ عالم پناہ بہار شریف میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے بزرگوں کے زیر سایہ ہوئی۔ تکمیل تعلیم بھی بہار شریف کے علمائے روزگار سے ہوئی۔ آپ کی ابتدائی زندگی غیر محتاط اور عیش پرست تھی۔ آزاد روش اختیار کئے ہوئے تھے لیکن جب آپ حضرت شاہ حسین عطا شطاریؒ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے تو آپ کی زندگی بالکل بدل گئی اور طلب حق کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوتے جیسا کہ مصنف تذکرہ مسلم شعرائے بہار نے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"اوائل حال میں عیش و طرب کی زندگی پر طلبِ فنا کھینچی تھی کہ آپ کا قدم جادۂ شریعت اور احتیاط سے پرے ہے۔ رفتہ رفتہ سعادتِ ازلی نے ہاتھ پکڑا اور عین شباب میں توبہ نصوح نصیب ہوئی یعنی حضرت شاہ حسین عطا شطاری قدس سرہٗ

کے دستِ حق پرست پر سلسلۂ فردوسیہ میں بیعت طریقت حاصل کر کے راہِ طلب حق کو اختیار کیا اور کمالاتِ باطنی سے آراستہ ہو کر جمیع سلسلۂ پیران سلاسل کے مجاز ہوئے"۔[1]

آپ کو حضرت شاہ ابوالحسنؒ بن حضرت شاہ ابوالبرکات ابوالعلائیؒ اور حضرت حمیدالدین راجگیریؒ سے بھی ارشادِ طریقت حاصل تھا۔ گیارہ سال کی عمر سے ہی شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا۔ فارسی میں دست گاہ حاصل کی۔ اس لئے پہلے فارسی میں شاعری کی اس کے بعد اردو میں بھی ذوق شعری کو پروان چڑھایا۔ فارسی میں ظلومؔ تخلص تھا اور اس میں علی حزیںؔ کا رنگ پسند تھا اردو میں وحدؔ تخلص تھا۔ آپ نے کسی سے اصلاحِ سخن نہ لی، آپ فطری شاعر تھے، تصوف سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس لئے آپ کے کلام میں حقائق و معارف کا گہرا امتزاج ہے۔ آپ کا وصال ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں ہوا۔ بڑی درگاہ بہار شریف میں مدفون ہوئے۔ آپ کا مزارِ مبارک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ آپ کے بعد مسند سجادگی پر آپ کے فرزند و جانشیں جناب حضور شاہ امین احمد شوقؔ بہاری جلوہ افروز ہوئے۔ حضرت وحدؔ کے یہاں صوفیانہ خیالات بڑے دلکش پیرائے میں پائے جاتے ہیں۔

تصوف میں عشق و سرمستی کی بڑی اہمیت ہے اس لئے کہ اسی سے منازلِ سلوک طے ہوتے ہیں۔ اس کیفیت کو حضرت وحدؔ کے اشعار میں دیکھئے ؎

صبا کی طرح رہا میں بھی کو بکو پھرتا ‏‏ ہمارے دل سے بھی اس گل کی جستجو نہ گئی
مجھے بھی تیرے رہِ عشق میں ہے زور کی پیاس ‏‏ کہ آبِ تیغ سے بھی خشکیٔ گلو نہ گئی

اور فقر و غنا کا فلسفہ وحدؔ کے اشعار میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ ؎

ہاتھ آتی نہیں زنہار فقیری میں غنا ‏‏ تا نہ دل پائے بداماں قناعت رہئے
کعبۂ دل ہی عجب قبلۂ حاجات ہے شیخ ‏‏ سر جھکائے یہاں مصروفِ عبادت رہئے

صوفی شاعر کی حیثیت سے حضرت وحدؔ ایک منفرد مقام کے مالک ہیں اس لئے کہ ان کی شاعری میں

---

[1] تذکرہ مسلم شعرائے بہار ص ۱۲۹ حصہ پنجم۔

صوفیانہ تفکر تنوع کے ساتھ ہے۔ ان کے یہاں میر کا درد و سوز بھی ہے اور درد کا تصوف بھی۔ حضرت وحید کی شاعری کے سلسلے میں ڈاکٹر کلیم احمد عاجز اس طرح رقم طراز ہیں:-

"حضرت وحید شعر و سخن میں کسی کے شاگرد نہیں ان کی مشق کسی استاد کی رہینِ منت نہیں۔ ان کے مزاج میں بڑا تنوع ہے کبھی فارسی کے تتبع میں خارجیت کی طرف آتے ہیں تو دور تک بہتے چلے جاتے ہیں، مضمون آفرینی کی طرف آتے ہیں تو فکر و فلسفہ کا سمندر ابل پڑتا ہے۔ عشق و مستی بھی ہے، رندی اور شاہد پرستی بھی ہے، شاہی اور امیری بھی ہے، قلندری اور فقیری بھی ہے، دنیا دار بھی ہیں اور دنیا سے بے نیاز بھی، دیوانہ و چاک گریباں بھی، ہوشیار ساز و سامان بھی، رند اور محتسب بھی ہیں، ناصح و مشفق بھی، صوفی اور شرابی بھی۔ حضرت وحید کے یہاں تجربات کی گوناگونی اور مشاہدات کی بوقلمونی ہے، جذبات و احساسات کا تنوع ہے۔"[1]

وحید کی اس غزل میں تصوف کی حقیقت کو دیکھیے۔ ؎

ذلتِ عشق کو سمجھے ہوئے عزت رہیے — کتنا ہی اس کے سبب بابِ مذلت رہیے
گر حقیقی نہیں ہے عشق مجازی ہی سہی — رہ کے عشق سے پیدا کسی بابت رہیے
مذہبِ عشق سے وسعت نہیں رکھتا کوئی — اختیار اس کا کیے مذہب و ملت رہیے
دوستی ہی کا پڑے راہِ طلب میں ہر گام — آشنائی کے لیے آوارۂ غربت رہیے

لاگ سے لاگ رہے دل کو بہر حال اے وحید
سوز یا ساز میں جس حال میں حضرت رہیے

---

[1] تحقیقی مقالہ۔ مخطوطہ از ڈاکٹر کلیم احمد عاجز ص ۱۶۲

حضرت سید شاہ عطا حسین فانی گیاوی

حضرت سید شاہ عطا حسین المتخلص بہ فانی گیاوی صوبہ بہار کے ایک مشہور صوفی خانوادہ داناپور کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کا جدی و مادری نسب نامہ حضرت عبداللہ بن امام محمد باقر پر منتہی ہوتا ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت سنہ ۱۲۲۲ھ میں داناپور میں ہوئی۔ علوم درسیہ کی تعلیم اپنے خاندان میں ہی ہوئی۔ تعلیم باطنی کی طرف دل متوجہ ہوا تو سب سے پہلے اپنے جد امجد حضرت سید شاہ غلام حسین داناپوری کے دستِ حق پرست پر سلسلہ چشتیہ خضریہ منعمیہ میں بیعت ہوئے اور اجازت و خلافت سے بھی نوازے گئے۔ تعلیم روحانی کی تکمیل کا جب ذوق زیادہ ہوا تو اسی وقت آپ کے پیر کا وصال ہو گیا اس لئے حضرت فانی نے علوم باطنی کی تکمیل اپنے ماموں قطب العصر حضرت سید شاہ قمرالدین حسین عظیم آبادی سے کی۔ آپ انگریزی دورِ حکومت میں نوکری کے سلسلے میں غازی پور گئے اور وہاں تحصیلدار مقرر ہوئے۔ اسی دوران آپ کو اپنے مرشد حضرت شاہ قمرالدین حسینؒ کے وصال کی خبر ملی یہ سنکر آپ اپنے عہدہ سے مستعفی ہو کر عظیم آباد واپس آگئے۔ آپ سنہ ۱۲۶۰ھ میں پاپیادہ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ وہ سارے حالات آپ اپنے اردو سفرنامہ "ہدایت المسافرین" میں تحریر فرماتے ہیں۔ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران عالم مثال میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حاضری ہوئی وہاں سے آپ کو گیا (صوبہ بہار) جانے کا حکم ہوا۔ بحکم نبوی صلے اللہ علیہ وسلم آپ سنہ ۱۲۶۵ھ میں گیا تشریف لائے اور مولوی سید شرف حسین صدر الصدور، ساکن سورج گڈھ ضلع مونگیر کے مکان پر قیام کیا اور رشد و ہدایت کا سلسلہ وہیں سے جاری ہوا۔

۱۔ یہ تمام واقعات اپنے مثنوی سیر عطا میں حضرت سید شاہ عطا حسین فانی نے منظوم کیا ہے۔ مثنوی قلمی ہے اور خانقاہ منعمیہ گیا میں محفوظ ہے۔

حضرت فانی کثیر التصانیف بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کی تصنیفات و تالیفات میں کم و بیش ۵ ۲ رسالے ہیں۔ آپ کے دو اردو دیوان خانقاہ منعمیہ ابو العلائیہ رام ساگر گیا میں محفوظ ہیں۔ راقم الحروف نے صرف ایک دیوان کی زیارت کی ہے۔ اردو میں تصوف کے نکات پر تین مثنویاں ہیں۔ ایک مثنوی سر عطا، دوسری مثنوی گنجینۂ اولیاء تیسری مثنوی سر حق (مطبوعہ)۔ مذکورہ دو مثنویاں ابھی تک مخطوطہ کی شکل میں خانقاہ منعمیہ کی زینت ہیں۔ آپ کا وصال ۱۷ شوال ۱۳۱۱ھ میں گیا میں ہوا اور اپنی خانقاہ ہی میں مدفون ہوئے۔ آپ کا مزار مبارک آج بھی مرجع خلائق ہے۔

آپ کو شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ آپ نے فارسی کے صوفی شعراء کے اشعار کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور خاطر خواہ استفادہ کیا۔ فطری لگاؤ نے اس جذبے کو تیز کیا اور آپ کا کلام حقائق و معارف سے منور ہو گیا۔ حضرت فانی کے کلام میں صوفیانہ حقائق کی جلوہ گری ہے ندرتِ خیال اور زبان و بیان کی بھی دلکشی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

ذاکر کے تو ہے زعم میں مذکور نہاں میں   عارف تو اسے دیکھتے ہیں عین عیاں میں
مردانِ خدا جو ہیں وہ ہیں عارف باللہ   تفریق نہیں ہے کہ کچھ پیر و جواں میں
کعبہ میں اسے ڈھونڈتے ہیں عابد و ساجد   سالک اسے سمجھے ہے کہ ہیں کون و مکاں میں

خواجہ میر درد کی مشہور غزل ہے جس کا ایک مشہور شعر ہے ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جا ابھی   دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

فانی کی بھی ایک غزل اسی انداز کی ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

گر پاس تو نہ ہو تو تری جستجو کریں   ہم دیکھتے رہیں تجھے جس سمت رو کریں
سجدہ ہو تیرے در پہ مرا اس گھڑی قبول   رو رو کے اپنے اشک سے جس دم وضو کریں
شرمندہ ہوں گناہ سے اپنے میں اس قدر   کیا چشم پر گناہ کو ترے دو بدو کریں
بندہ قصور وار ہے خالق مرا غفور   اب خوفِ حشر دل میں بھلا ہم کبھو کریں
کارِ مجاز مجھ پہ ہوا اس قدر بلند   خرقہ کو چاک کر کے کہا ہا و ہو کریں

فانی کو تو دکھا ئیو اپنا جمال پاک
جس دم بروزِ حشر ترے رو برو کریں

حضرت شاہ امین احمد شوق بہاریؒ

آپ حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے اخلاف و اولاد میں سے ہیں یعنی حضرت سید شاہ امیرالدین وجدؔ کے صاحبزادے اور جانشین ہیں۔ آپ کا اسم شریف امین احمد اور لقب جناب حضور ہے۔ آپ اپنے عہد کے صاحبِ علم و فضل بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۴۸ھ میں خانقاہ بہار شریف میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم خاندان میں ہوتی رہی اور تکمیلِ تعلیم بہار شریف کے مشاہیر علما سے ہوئی۔ تعلیم کے بعد مطالعہ کا شوق کافی رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی میں آپ اپنی ظاہری بینائی سے محروم ہو گئے۔ لیکن بینائی باطن نے آپ کو مزید بصارت بخشی۔ تعلیم ظاہری کے بعد تعلیم روحانی میں مشغول ہوئے خانقاہ شعیبیہ شیخپورہ کے سجادہ نشین جیّد اور پیر طریقت حضرت سید شاہ جمال علی بلخیؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے۔ آپ کے پیر و مرشد نے آپ کو اجازت و خلافت سے سرفراز فرمایا اور تعلیم باطنی اور روحانی کے لئے خانقاہ اسلام پور کے سجادہ نشین مرشد کامل حضرت سید شاہ ولایت علی سہروردی قادری ابوالعلائیؒ کی خدمت میں بھیجا اور ہدایت کی کہ جو کچھ تم کو فیوض و برکات ملیں گے وہ انہی کے توجہِ خصوصی سے ملیں گے۔ آپ کافی لگن اور شغف کے ساتھ خدمتِ مرشد میں اکتسابِ فیض کرتے رہے۔ کبھی وہ خانقاہ اسلام پور مرشد کی خدمت میں جاتے اور کبھی آپ کے مرشد حضرت شاہ ولایت علی علیہ الرحمہ بہار شریف عرس میں شرکت کے لئے تشریف لے جاتے تو آپ کی صحبت و خدمت میں برابر حاضر رہتے۔ آپ کے مرشد کامل نے آپ کی شہرت و بزرگی کی بشارت دی تھی اور آپ کو اپنے تمام خاندانی سلاسل کی اجازت و خلافت سے سرفراز کیا۔ آپ کی شہرت و بزرگی کا فیضان دور دور تک پہنچا۔ ہندستان کے مختلف صوبوں میں آپ کے خلفاء بھی رشد و ہدایت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

آپ کو شعر و شاعری کا گہرا فطری ذوق تھا اگرچہ آپ نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔ خود ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

ہوں میں تلمیذ رحمانی فیض روحی سے کے گاہ　　شعر گوئی میں نہ دیکھا منہ کسی استاد کا

آپ قادر الکلام شاعر تھے۔ فارسی میں ثبات اور اردو میں شوقؔ تخلص فرماتے تھے۔ مثنوی گوئی میں کمال حاصل تھا۔ فارسی میں آپ کی متعدد مثنویاں ہیں۔ خاص کر میر نجات اصفہانی کی بحر میں اسی روش کے مطابق آپ نے متعدد مثنویاں لکھی ہیں جو حسب ذیل ہیں :

(۱) شجرات طیبات : اس میں مختلف بحروں میں شجرے منظوم کئے گئے ہیں اور ایک مناجات بھی شامل ہے۔

(۲) گلِ بہشتی : اس میں پیران چشت کے مختصر احوال منظوم ہیں۔

(۳) گلِ فردوس : اس میں اپنا نسب نامہ بھی منظوم کیا ہے۔

(۴) سلسلۃ الآلی : یہ مختلف شجروں کا مجموعہ ہے۔

یہ سب مثنویاں فارسی میں ہیں اور میر نجات اصفہانی کی بحر میں ہیں۔

جناب حضور حضرت شوقؔ بہاری نے اردو شاعری میں اپنی قادر الکلامی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ آپ کا مکمل دیوان ردیف وار مرتب ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ تقریباً دو سو رباعیاں بھی ہیں۔ کلام میں حقائق و معارف کی تعلیم ہے اور تغزل کا بھی گہرا رنگ ہے۔ عشق مجازی اور عشق حقیقی کی بھی جھلک نمایاں ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

ہے شغل تصور جو ترا دم بدم اپنا　　سب کار سے بڑھ کر ہے یہی کار اہم اپنا
انساں کا معاصی سے ہے بچنا نہیں آساں　　ہاں اس پہ خدا اگر کرے فضل و کرم اپنا

اور صوفیانہ خیالات کو عام فہم انداز میں ان اشعار میں دیکھئے ؎

اللہ ترا عام جو انعام ہو گیا　　جاری مری زباں پہ ترا نام ہو گیا
کر اس کی جستجو وہ ملے گا تجھے ضرور　　کوشش جو تو نے کی تو ترا کام ہو گیا

حضرت موصوف کی اس غزل میں تصوف کی چاشنی بھی ہے اور تغزل کا رنگ و آہنگ بھی ؎

عیاں کس جگہ تیرا جلوہ نہیں ہے　　ولیکن مجھے چشم بینا نہیں ہے

نگاہِ لطف کو ہرگز نہ کم کر — ستم اس سے کوئی زیادہ نہیں ہے
جو چاہے ستم کر گوارا ہے مجھ کو — مگر تیری فرقت گوارا نہیں ہے
ہے طاعت یہ مغرور نادان زاہد — ترے سجدہ میں رام دانا نہیں ہے
رہِ منزل دل نہ کیوں کر ہو مشکل — یہ پاؤں سے جانے کا رستہ نہیں ہے

تجھے بحرِ غم سے گزرنے کو اے شوق
ہماری غزل کا سفینہ نہیں ہے

آپ کا وصال ۴ رجادی الآخر ۱۳۲۱ھ کو خانقاہ بہار شریف میں ہوا اور بہار شریف کی بڑی درگاہ میں مدفون ہوئے۔ آپ کا مزار مرجعِ خلائق ہے۔

حضرت عبدالعلیم آسیؔ غازیپوری

حضرت آسیؔ غازیپوری دنیائے تصوف کے وہ تابندہ ستارے ہیں جن کی روشنی نے ایک جہاں کو منور اور فیضیاب کیا وہ صوفی باصفا تھے اور خانقاہ رشیدیہ کے زیب سجادہ بھی۔ وہ اردو کے صاحب طرز صوفی شاعر بھی تھے اور بافیض بزرگ بھی۔ آپ کی تربیت اگر بہار میں ہوئی تو تعلیم یوپی میں۔ دونوں کے فیوض روحانی اور تعلیم ظاہری و باطنی سے بہرہ مند ہیں۔ آپ کا نسب نامہ پدری حضرت ابراہیم ادہم بلخیؒ سے ملتا ہے تو حضرت خواجہ عبداللہ انصاری ہرویؒ سے بھی خونی لگاؤ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیانہ مزاج اور فقیرانہ انداز آپ نے اپنے خاندانی ورثے میں پایا۔

آپ کا نام عبدالعلیم اور تخلص آسیؔ تھا۔ پہلے آپ عاصیؔ تخلص کرتے تھے اور بعد میں آپ نے بدل کر آسیؔ کر دیا۔ آپ کی ولادت باسعادت ۹ شعبان المعظم ۱۲۵۰ھ میں قصبہ سکندر پور ضلع بلیا (یوپی) میں ہوئی۔ آپ ابھی دس ہی ماہ کے تھے کہ ماں کے سایۂ شفقت سے محروم ہو گئے۔ اس دُرِ یتیم کو آپ کی نانی صاحبہ نے اپنی آغوشِ عاطفت میں لے لیا اور ان کی نانیہال موضع قاضی پورہ ضلع آرہ (بہار) لے آئیں۔ جہاں وہ اپنے نانا مفتی احسان علی قدس سرہٗ سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرتے رہے جب آپ گیارہ سال کے ہوئے تو آپ کے والد حضرت محمد قنبر حسینؒ ۱۲۶۲ھ میں سکندر پور لیتے آئے۔ حضرت قنبر حسین کا تعلق ایک طرف فرنگی محل سے ہے تو دوسری طرف خاندانِ لمجیہ سے بھی۔ یہ حضرت آسیؔ کی خوش نصیبی تھی کہ ایک ہی سال کے بعد خانقاہ رشیدیہ کے سجادہ نشین حضرت قطب الہند غلام معین الدین امیری رشیدیؒ کی تشریف آوری سکندر پور میں ہوئی۔ اس جوہر کامل پر نظر پڑی۔ جوہر شناس مرشد کامل تھے۔ حضرت آسیؔ میں طلب صادق دیکھی تو انہیں سلسلہ قادریہ احمدیہ میں مرید کیا اور ان کو

تعلیم ظاہری و باطنی کے لئے اپنے ساتھ خانقاہ رشیدیہ جونپور لیتے آئے۔ جونپور میں اسی عہد میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا تھا جس کا نام مدرسہ حنفیہ تھا۔ اس مدرسہ میں تعلیم دینے کے لئے فرنگی محل کے مشہور علامہ مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی کو لکھنؤ سے بلایا گیا اور تھوڑے ہی دنوں میں آپ کی وجہ سے اس مدرسہ کی بڑی شہرت دور دور تک ہوئی اور یہاں حصول تعلیم کے لئے دور دور سے طلبا آنے لگے۔ حضرت آسی کو بھی حضرت مولینا سے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا استا نے بھی اس شاگرد میں جوہر کامل دیکھا تو ان پر خصوصی توجہ ہونے لگی۔ درسیات کی تمام کتابیں آپ سے پڑھیں بلکہ آپ نے فرمایا کہ اب پڑھانے کی ضرورت نہیں اتنی استعدادِ علمی پیدا ہوگئی ہے کہ مطالعہ ہی سے تکمیلِ تعلیم ہو جائے گی۔ آپ کو حصولِ تعلیم کا ایسا شغف تھا کہ کتابوں کے مطالعہ میں پوری رات گزر جاتی اور آپ کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ کتنی ساعت گزر رہی ہے۔ درسیات عربی و فارسی کی تکمیل کے بعد آپ کو علمِ طب کے حصول کا بھی شوق ہوا۔ فنِ طب کی تمام کتابوں کا ذوق و شوق اور انہماک کے ساتھ مطالعہ کیا اور اس میں مہارت حاصل کی حضرت کے لئے تسلیم و رضا اور صبر کا امتحان تھا کہ سب اولادیں صغر سنی ہی میں داغِ مفارقت دے گئیں اور صرف ایک نشانی ان کی نواسی عزت بی بی تھیں وہ بھی صرف دو مہینہ گیارہ دن سہاگن رہ کر بیوہ ہوگئیں اور انہوں نے بھی تاحیات بیوگی کی زندگی گزاری۔ حضرت آسی کی اولادِ ظاہری کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن وہ چونکہ صاحبِ سجادہ تھے اور رشد و ہدایت کا فیضان ان سے جاری تھا اس لئے وہ اولادِ ظاہری سے تو محروم ہو گئے لیکن اولادِ باطنی سے زندۂ جاوید ہیں۔

حضرت آسی نے دینی اور علمی ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں۔ صوفیانہ مزاج اور افکار نے بھی ان کے اخلاقِ حمیدہ کو اور بھی پاکیزہ اور پُر تاثیر بنا دیا۔ آپ نہایت منکسر المزاج تھے۔ خاندانی عزت و وقار اور ایک باعظمت خانقاہ رشیدیہ کے صاحبِ سجادہ ہونے کے باوجود جبہ و دستار اور تسبیح و مصلّیٰ کی ریاکاری کبھی نہ کی۔ بلکہ مروت و بردباری، ایثار و قربانی اور خلوص و محبت کے پیکر تھے آپ کا دل خلوص و محبت کا سرچشمہ تھا۔ دنیائے تصوف کا یہ تابندہ ستارہ ۲ جمادی الاول ۱۳۲۵ھ میں غروب ہو گیا اور غازی پور کے محلہ نور الدین پورہ

میں مدفون ہوئے۔ آپ کا مزار مبارک زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

حضرت آسی فطری شاعر تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے انہیں سخن فہمی اور سخن گوئی کی فطری صلاحیت ودیعت کی تھی۔ آپ حضرت فضل الٰہ آبادی دائرہ شاہ اجمل الٰہ آباد کے شاگرد تھے اور وہ ناسخ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ اس اعتبار سے آسی فن شاعری میں دبستانِ لکھنؤ کے تربیت یافتہ ہیں۔ غازیپور چونکہ آپ کی سسرال تھی اور وہاں آپ طبابت کرتے تھے۔ اس عہد میں غازیپور میں مدرسہ چشمۂ رحمت علم و ادب کا گہوارہ تھا جس میں ہندوستان کے مشاہیر علماء درس و تدریس میں مشغول تھے۔ شبلی نعمانی اور شمشاد لکھنوی جیسے متعلم بھی تھے اور فاروق چریاکوٹی اور مولوی رحمت اللہ جیسے معلم بھی۔ ناسخ لکھنوی کے شاگرد ان بھی اس علمی ادارہ سے منسلک تھے۔ چنانچہ وہ لوگ حضرت آسی کی خدمت میں بھی جاتے اور یہی سبب ہے کہ شمشاد لکھنوی حضرت آسی کی خدمت میں آئے۔ غازی پور کی علمی اور ادبی فضا نے حضرت آسی کے فن شاعری کو اور جلا بخشی۔ ناسخ اسکول کے زبان و بیان کی پابندی حضرت آسی نے کی لیکن مزاج کی ہم آہنگی نہ ہو سکی۔ وہ چونکہ صوفی صافی تھے اس لئے عشق حقیقی سے ان کا دل معمور تھا۔ کائنات عالم کا مشاہدہ جس میں مظاہر خداوندی کی جلوہ آرائیاں ہیں وہ انہیں وحدت الشہود کی طرف کھینچتا ہے تو فنائیت کی تعلیم اور سپردگی کی کیفیت انہیں وحدت الوجود کی تعلیم دیتی ہے۔ وہ اپنے مشاہدات کی گیرائی اور گہرائی سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجاز کی رنگارنگی بھی حقیقت کی ہنگامہ آرائی کو فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ صاحبِ دل تھے اس لئے ان کے یہاں جو عشق حقیقی کی تڑپ، داخلی کوائف کی گرمی، واردات قلبی کی سرمستی اور مشاہدات کی آئینہ سامانی ہے اس ذوق کی تسکین کے لئے صرف داخلیت میں پناہ مل سکتی ہے اور تصوف ہی میں داخلیت کی جلوہ گری ہے۔ حضرت آسی چونکہ صوفی باصفا تھے اس لئے ان کے شعری ذوق اور وجدان و کیف کے سکون کے لئے حقائق و معارف کی آگہی، عشق و سرمستی کی چاشنی اور کیف و سرور کی وابستگی ضروری تھی۔ اس لئے حضرت آسی کی اردو شاعری تصوف کے حقائق و معارف کا آئینہ ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ حضرت آسی کا اپنا رنگ ہے اور اس رنگ میں وہ منفرد ہیں۔

ان کے کلام میں تصوف کی جلوہ آرائیاں ہیں اور عشق حقیقی کی سرمستیاں۔ ان کی غزلوں میں ان کی واردات قلبی، دل کی فنائیت کا سوز، عشق حقیقی کی تپش اور عشق مجازی کی آئینہ سامانی ہے۔ ان کا والہانہ پن جس میں سپردگی کی کیفیت ہے۔ آسی کا کلام ان تمام حقائق کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس رنگ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

تاب دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا   منھ قیامت میں دکھا سکنے کے قابل دینا
تیرے دیوانے کو بے حال ہی رہنا اچھا   حال دینا ہو اگر رحم کے قابل دینا

اسی کے جلوے تھے لیکن وصال یار نہ تھا   میں اس کے واسطے کس وقت بیقرار نہ تھا

رو کے آسی پوچھتا تھا کب قیامت آئیگی   کس طرح کہیے کہ وہ تیرا تمنائی نہ تھا

تو رات جہاں جلوہ کا سنا نہ دل تھا   آج اس کو جو دیکھا تو وہ دیوانہ دل تھا

کسی در پہ پڑا رو رو کے آسی رات کہتا تھا   کہ آخر میں تمہارا بندہ ہوں تم بندہ پرور ہو

وعدہ بھی ہے تو ہے قیامت کا   جس کو ہم آزما نہیں سکتے

ابھی دیکھا نہیں اس پر تو یہ بیتابی ہے   دیکھئے دیکھ کے کیا حال مرا ہوتا ہے

غبار ہو کے بھی آسی پھرو گے آوارہ   جنونِ عشق سے ممکن نہیں ہے چھٹکارا
اگر بیانِ حقیقت نہ ہو مجاز کے ساتھ   تو شعر لغو ہے آسی کلام ناکارا

مذکورہ بالا اشعار عشق حقیقی کے موضوع پر ہیں۔ اس میں عشق حقیقی کی وہ دھیمی دھیمی آنچ ہے جس میں عاشق جلتا ہے اور تڑپتا ہے لیکن اس کے سوز میں وہ لذت اور سکون ہے جو عاشق

کا سرمایۂ حیات ہے۔

عشق حقیقی میں کچھ ایسی بھی کیفیتیں ہوتی ہیں کہ معشوق حقیقی کے دیدار کے لئے اس کو خارجی پیکر عطا کرکے اسے معشوق مجازی بنا دیا جاتا ہے تاکہ اس سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہو سکے۔ حضرت آسی کے کلام میں بھی پیکر تراشی ہے اور ان کا معشوق حقیقی معشوق مجازی کے پیکر میں جلوہ گر نظر آتا ہے اور اس سے ہم کلامی اگرچہ جرم نابخشیدہ ہے پھر بھی عاشق اس کے سرور اور لذت سے اس لئے مکیف ہے کہ اس کا معشوق مجازی اپنے عاشقانہ انداز میں اپنے فضل و کرم کا سزاوار کرنا چاہتا ہے۔ حضرت آسی نے کتنے حسین انداز میں اس خیال کو پیش کیا ہے۔ ؎

آسی گستاخ کا ہر جرم نابخشیدہ ہے	حشر میں منھ پھیر کر کہنا کسی کا ہائے ہائے
گھونگھٹ اس پردہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے	بے حجابی یہ کہ ہر صورت میں جلوہ آشکار

کہ خاص لوگ طلب ہو نگے بار عام کے بعد	وہاں بھی وعدۂ دیدار اس طرح ٹالا

مجنوں گورکھپوری اپنے مضمون "حضرت آسی کا تغزل" میں لکھتے ہیں:-

"مشرق کے صوفی شاعروں میں صرف دو ہستیاں ایسی نظر آتی ہیں جنہوں نے مجاز کی حقیقت اور قدسیت کو کما حقہٗ تسلیم کیا ہے اور جن کے مسلک کو مجازیت کہا جاسکتا ہے۔ ایک تو حافظ دوسرے آسی۔ درد کے تصوف کی دھوم محض تاریخ شعر اردو کی ایک رسم ہے وہ خود کتنے ہی زبردست صوفی کیوں نہ رہے ہوں۔ لیکن شاعری میں ان کا شعور عشق بہت ادنی سطح پر اور وہ معاملۂ عشق میں محض ایک نوآموز معلوم ہوتے ہیں۔ آتش میں تصوف اور تغزل دونوں کے قوی اور شدید امکانات موجود تھے لیکن زمانہ اور ماحول نے نہ تو ان کے تصوف کو اچھی طرح نمایاں ہونے دیا نہ تغزل کو۔ آسی کے یہاں تصوف اور تغزل یا حقیقت اور مجاز دونوں ایک مزاج ہو کر نمایاں ہوئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حقیقت والے اس کو حقیقت سمجھتے ہیں اور مجاز والے مجاز۔"[۱]

---

[۱] غزل سرا صفحہ ۱۱ مصنفہ مجنوں گورکھپوری۔

عشق میں سپردگی، فنائیت کی منزل ہے۔ حضرت آسی کے کلام میں سپردگی اور فنائیت کی ایسی کیفیت ہے جو اسے منزل فنا سے مقام بقا تک پہنچاتی ہے۔ ان کے اشعار میں فنائیت کی کتنی لذت ہے اور اس لذت سے آشنائی حضرت آسی کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے ؎

اتنا تو جانتے ہیں کہ عاشق فنا ہوا　　اور اس سے آگے بڑھ کے خدا جانے کیا ہوا

جز فنا عشق کی تدبیر میسر نہ ہوئی　　زندگی موت سے آخر کبھی جان بر نہ ہوئی

نور خورشید ستاروں کو مٹا دیتا ہے　　تم ہو پہلو میں تو محفل میں ہے خلوت مجھ کو

کسی میں جو کوئی فنا ہو گیا　　نہ کچھ پوچھ آسی وہ کیا ہو گیا

نقد ہستی، نثار یار کرے　　یہ نہیں ہے تو پھر محبت کیا

غیر کا اب گزر نہیں دل تک　　عشق عہدہ ہے پاسبانی کا

تصوف ایک ذوقی اور وجدانی شئے ہے اور عشق میں بھی وجدان کا عمل دخل ہے۔ حضرت آسی صوفی شاعر تھے۔ وہ عملی طور پر اور وجدانی طور پر نہ جانے تجربے اور کیفیات کی کن کن منزلوں سے گزرے ہیں ان کے کلام سے عشق کی والہانہ کیفیت کا مشاہدہ بھی سامنے آجاتا ہے۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

عاشق کی جان کنی پر تنہا نہ یار رویا　　جس سنگدل نے دیکھا بے اختیار رویا
برباد کر دیا جب قسمت نے گلستاں سے　　ابر بہار بن کر میرا غبار رویا
ثابت جو ہو رہی تھی گلشن کی بے ثباتی　　جوں جوں ہنسے گل تر میں زار زار رویا

عشق میں اے کوہکن کیا زخم سر درکار تھا　　زخم دل درکار تھا نہ زخم جگر درکار تھا

اب تو پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسیؔ ہے شبِ گور بھی اس گل کی ملاقات کی رات

کسی نے کی رہِ کعبہ کوئی گیا سوئے دیر پڑے رہے ترے بندے مگر ترے در پر

مذکورہ بالا اشعار عشق کے مختلف کیفیات کے ترجمان ہیں۔ کہیں عشقِ حقیقی کی ترجمانی ہے تو کسی میں عشقِ مجازی کی پردہ دری۔ لیکن یہ اشعار دل کو اس طرح چھوتے ہیں جس سے ہر سننے والا بھی مکیف ہو جاتا ہے۔

فنِ تصوف میں اور مصطلحاتِ تصوف میں وحدت الوجود کا مسلک بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمہ اوست کا فلسفہ اسی سے نکلا ہے۔ حضرت محی الدین ابن عربیؒ نے اپنی تصنیف میں اس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور صوفیائے کرام نے اس مسلک پر کثرت سے کتابیں لکھی ہیں۔ جمہور صوفیا کا مسلک ہے کہ ظاہر اور باطن میں خدا کے سوا کوئی موجود نہیں۔ یہ عالم جو خدا کو غیر معلوم ہوتا ہے اور جسے ماسوا بھی کہتے ہیں، حقیقت میں ماسوا نہیں ہے۔ وہ نہ خدا کے علاوہ ہے نہ خدا کے غیر ہے بلکہ خدا کا مظہر ہے۔ یہ غیریت اور کثرت جسے ہم محسوس کرتے ہیں دراصل وحدت ہے اور یہ جو کچھ ہمیں نظر آتے ہیں یہ سب اسی کے کرشمے ہیں اور یہ سب فنا ہو کر اسی ایک وحدت میں مل جائیں گے۔ فارسی اور اردو شاعری میں بھی اس خیال کو شعری پیکر بخشا گیا ہے حضرت آسیؔ کا کمال یہ ہے کہ وحدت الوجود کے مسلک کو اتنے دلکش انداز میں پیش کیا ہے کہ اس میں ان کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ وحدت الوجود کا مسلک آسیؔ کے اشعار میں دیکھیے

وصل ہے پر دل میں اب تک ذوقِ غم پیچیدہ ہے
بلبلہ ہے عینِ دریا میں مگر نم دیدہ ہے

اتنے بت خانوں میں سجدے ایک کعبے کے عوض
کفر تو اسلام سے بڑھ کر ترا گرویدہ ہے

کعبہ، بت خانہ، کلیسا، صومعہ پھرتے ہیں در در کہ تیرا گھر ملے

بجز تمہارے کسی کا وجود ہو یہ محال　　مگر تمہیں نظر آتے ہو ماسوا ہو کر

جا کے بت خانے میں کس طرح نہ سجدہ کرتے　　بت میں بھی تو نظر آیا تو بتا کیا کرتے

مذکورہ بالا اشعار اگرچہ وحدت الوجود کے فلسفیانہ مسلک کے ترجمان ہیں لیکن اس میں ایسی رنگ آمیزی ہوتی ہے کہ اس میں دلکشی پیدا ہو گئی ہے اور حضرت آسی نے شاعرانہ صناعی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

وحدت الشہود بھی تصوف کا اہم ترین مسلک ہے۔ "ہمہ از وست" کا فلسفہ اسی سے نکلا۔ حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہندی علیہ الرحمۃ نے اس نظریے کی اشاعت کی۔ خواجہ میر درد اور مظہر جانجاناں نے اردو شاعری میں بھی اس خیال کو پیش کیا۔ اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ معبود حقیقی صرف خدائے تعالےٰ ہے۔ لیکن عالم جو موجود ہے اور خدا کے ماسوا کی حیثیت سے ہے اس کا وجود وہی ہے جیسے آفتاب کے طلوع کے وقت ستارے نظر نہیں آتے ہیں مگر وہ معدوم نہیں ہو جاتے۔ یہ تمام نظارے اور مناظرِ قدرت مظاہر خداوندی ہیں اور یہی اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ہر چیز میں خدا کی جلوہ گری ہے مگر خدا ایک ہے۔ حضرت آسی نے بھی اس مسلک کو پرکشش انداز میں اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔ اس قبیل کے اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

بے حجابی یہ کہ ہر صورت میں جلوہ آشکار　　گھونگھٹ اس پر وہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے
دیکھئے کس چیز سے تشبیہ تیرے حسن کو　　ایک تو ہی دیدہ ہے تیرے سوا نادیدہ ہے

عالم ایک آئینہ خانہ ہے ترے جلوے کا　　ہم جدھر دیکھتے آخر تجھے دیکھا کرتے

جز ترے کچھ نہیں موجود تری ذات ہے وہ　　جا بجا تو نظر آتا ہے یہی عالم ہے
عشق کہتا ہے کہ عالم سے جدا ہو جاؤ　　حسن کہتا ہے جدھر جاؤ نیا عالم ہے

حضرت آسی نے بھی صنف غزل کو اپنے صوفیانہ خیالات سے تقدس بخشا ہے۔ اپنے

والہانہ انداز اور دل کی مختلف کیفیتوں سے اسے کیف آگیں بنایا۔ جذبات و الفت سے اس میں نئی روح پھونکی۔ حقیقت کو بھی مجاز کے پردے میں پیش کیا تصوف میں بھی پیکر تراشی کی۔ ان حقائق کی روشنی میں حضرت آسی کی اس غزل کا مطالعہ کیجئے ؎

وصل ہے پر دل میں اب تک ذوقِ غم پیچیدہ ہے
بلبلہ ہے عین دریا میں مگر نم دیدہ ہے

سجدہ تیرا فرض سمجھا جو تیرا گرویدہ ہے
ماہِ نو بہرِ فلک کا جبہ سائیدہ ہے

بے حجابی یہ کہ ہر صورت میں جلوہ آشکار
گھونگھٹ اس پردہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

دل کی وسعت وہ کہ نقطے سے بھی کم سات آسماں
جسم یہ لاغر خط وہمی سے بھی کاہیدہ ہے

فتنۂ روزِ حشر سب سمجھے ہیں جس میدان کو
دامنِ نازِ نگہہ کا گوشہ جنبیدہ ہے

دیکھئے کس چیز سے تشبیہ تیرے حسن کو
ایک تو ہی دیدہ ہے تیرے سوا نادیدہ ہے

دم بخود رہئے وہ کیوں رسوا ہو مجھ کو چھیڑ کر
غیر دریا بلبلے میں اور کیا پوشیدہ ہے

دیکھ کر محشر خرامی ان کی اب سمجھا ہوں میں
ذرہ ذرہ کاروانِ فتنۂ خوابیدہ ہے

وادیٔ عرفاں میں داغِ تہمتِ دخل دوئی
نقشِ پائے ناتوانِ عارفِ لغزیدہ ہے

منھ لگاتا تھا کہ سب گرد کدورت دور تھی
بادۂ گلگوں مزاجِ عاشق رنجیدہ ہے

ہجر میں کیسا زمین و آسمان کا فاصلہ

جو ستارا ہے وہ داغِ حسرت بالیدہ ہے

اتنے بت خانوں میں سجدے ایک کعبے کے عوض

کفر تو اسلام سے بڑھ کر نزاکت دیدہ ہے

آدمی کی سرکشی غفلت ہے اپنے اصل سے

ذوقِ سجدہ قطرۂ افتادہ میں پیچیدہ ہے

بادۂ رنگِ فنا کا شیشۂ نازک مزاج

یا حبابِ بحر، یا میرا دلِ شوریدہ ہے

دیر کیوں اے اذنِ جنت منزلِ میزاں کے بعد

اب تو ظاہر ہے کہ میرا ہر عمل سنجیدہ ہے

عاشقِ گریاں نے رات اپنی تڑپ کر صبح کی

چشمِ اشک آلودہ بھی زخمِ نمک پاشیدہ ہے

چشمِ نقشِ پا سبھی کیوں کہیں اس کو ہم ہیں فنا

جس نے تیری چال کو دیکھا قیامت دیدہ ہے

حشر میں منھ پھیر کر کہنا کسی کا ہائے ہائے

آسی گستاخ کا ہر جرم نا بخشیدہ ہے

مذکورہ بالا غزل میں رنگِ تغزل بھی ہے اور صوفیانہ خیالات کی ہم آہنگی بھی ہے اور ربط و اتحاد بھی۔ اس کی کیفیت میں بھی ارتقائی کیفیت ہے۔ تصوف کے مختلف حقائق و معارف کو خواہ وہ وحدت الوجود ہو یا وحدت الشہود، فنائیت کی تعلیم ہو یا والہانہ پن کا کیف و سرور۔ غرض کہ یہ پوری غزل تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ دوسری غزل کے سوز و گداز سے بھی مکیف ہوں۔ ؎

بدرقہ راہِ طلب میں نہیں ہمت کے سوا رہبر کوئی نہیں جوششِ محبت کے سوا

اور کیا چاہتی ہے آرزوئے دل ان سے کچھ نہیں حسن کی سرکار میں حسرت کے سوا

نظر و ناظر و منظور نہ جب ایک ہوتے　　کیا ملا روزِ قیامت میں ندامت کے سوا
کچھ خبر کوچۂ جاناں کی بھی ہے اے واعظ　　عشقبازوں کی ہے جنت تری جنت کے سوا
تابعِ خواہشِ محبوب ہو خواہش جس کی　　رنج پاس اسکے نہ آئے کبھی راحت کے سوا
حسنِ صورت کیلئے خوبیٔ سیرت ہے ضرور　　گل وہی جس میں کہ خوشبو بھی ہو رنگت کے سوا

پوچھتے ہو شہ جیلاں کے فضائل آسی
ہر فضیلت کے وہ جامع ہیں نبوت کے سوا

حضرت آسیؔ کے صوفیانہ رنگ کو اس غزل میں بھی دیکھئے ؎

حرص دولت کی نہ عز و جاہ کی　　بس تمنا ہے دلِ آگاہ کی
دردِ دل کتنا پسند آیا اسے　　میں نے جب کی آہ اس نے واہ کی
بس سلوک اس کا ہے منزل اسکی ہے　　اس کے دل تک جس نے اپنی راہ کی
کس کی حسرت نے جگایا تھا ہمیں　　نیند سوتے قبر میں نوشاہ کی
واعظو کیسا بتوں کا گھورنا　　کچھ خبر ہے ثم وجہ اللہ کی
مجھ سے مجرم کے لئے خلد بریں　　مہربانی ہے رسول اللہ کی

راہِ حق کی ہے اگر آسی تلاش
خاکِ رہ ہو مردِ حق آگاہ کی

دوسری غزل میں بھی اسی رنگِ تصوف کو ملاحظہ کیجئے ؎

پوچھتے ہو کہ سرِ وحدت کیا　　ماسوا کی بھلا حقیقت کیا
نہ گرے اس نگاہ سے کوئی　　اور افتاد کیا مصیبت کیا
نقدِ ہستی نثارِ یار کرے　　یہ نہیں ہے تو پھر محبت کیا
عاشقی میں ہے محویت درکار　　راحت وصل و رنج فرقت کیا
جن میں چرچا نہ کچھ تمہارا ہو　　ایسے احباب ایسی صحبت کیا
اب سمجھتا ہے منکرِ سجدہ　　آدمی کیا ہے آدمیت کیا
اس سے مل جو ہمیشہ ساتھ رہے　　بیوفاؤں سے لطفِ صحبت کیا

باغ رضواں بھی باغ ہے آخر | سیر گل کے لئے ریاضت کیا
ملنے والوں سے راہ پیدا کر | اس کے ملنے کی اور صورت کیا
[illegible] سے جو کچھ ہو | مہربی [illegible] اور مہربی ہمت کیا
گوشہ گیری [illegible] کے ساتھ | دل تہا مجمع میں سب تو عزلت کیا
اور ہمت بلند [illegible] اسے [illegible] | طمع اور خوف کی عبادت کیا
یوں تو تم سے میں کہیں جا نہ ہوں | دوسرا جب ہو تو خلوت کیا

آسی مست کا کلام سنو

وعظ کیا، پند کیا، نصیحت کیا

مذکورہ بالا تینوں غزلیں صوفیانہ خیالات سے لبریز ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی پُر تاثیر ہیں۔ اگر ان غزلوں کا تجزیہ کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہر شعر میں تصوف کے مختلف نکات ہیں جن میں بے پناہ جاذبیت اور کیف و سرور ہے اس میں غزل کی رنگارنگی بھی ہے اور تصوف کی لذت و چاشنی بھی۔ یہ ایک صوفی کے دل کی آواز ہے جو سننے والے کے دل میں اتر جاتی ہے اور اس کے ذوق کو سیراب کرتی ہوئی ایک دوسری دنیا میں لے جاتی ہے جو ایک ایسی دنیا ہے جس میں عشق حقیقی کی دھیمی دھیمی آنچ اسے لذت و سرور بخشتی ہے۔ وحدت الوجود کا مسئلہ ہو یا وحدت الشہود کا نظریہ سب ہی میں کیف و سرور کی دل آویزی ہے۔ آسی کے اشعار میں جو والہانہ پن ہے وہ انہیں دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے بلکہ مجھے تو یہ کہنے دیجئے کہ اس میدان میں وہ حضرت مظہر جانجاناںؒ اور خواجہ میر درد سے آگے نہیں تو ان کے مدِ مقابل ضرور نظر آتے ہیں اور حضرت آسی کا یہی اپنا منفرد رنگ ہے لیکن افسوس کہ حضرت آسی کو وہ مرتبہ نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ اسی لئے مجنوں گورکھپوری نے ناقدینِ اردو سے حضرت آسی کی ناقدر شناسی کا شکوہ ان الفاظ میں کیا ہے :-

"دنیا میں محرومی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ جس چیز کو چاہو وہ نہ ملے۔ دوسری یہ کہ ایک ملی ہوئی دولت کی صحیح اور کما حقہٗ قدر نہ کی جائے۔ اگر ایک طرف ایسوں کی تعداد بے شمار ہے جو عمر بھر اکسیر کی تلاش کرتے رہے

اور نہ پا سکے تو دوسری طرف ایسوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جن کو اکسیر ملنے کو تو بار بار ملی مگر وہ بیشتر اوقات اس کو خاک سمجھتے رہے۔ میں جب آسی غازی پوری کی شاعری پر غور کرتا ہوں اور پھر اس ناشناسی اور بیگانہ وشی کو دیکھتا ہوں جس کو اردو شاعری کے نقادوں نے ان کے حق میں برتا ہے تو مجھے اس دوسری قسم ہی کی محرومی کی مثال نظر آتی ہے۔[1]

---

[1] غزل سرا مصنفہ مجنوں گورکھپوری۔ حضرت آسی کا تغزل صفحہ ۱۵۳

صوفیانہ شاعری صفحہ ۱۶

حضرت سید شاہ فرزند علی صوفی منیریؒ

(۱) حضرت فرزند علی صوفی منیریؒ اوصاف اور مشرب ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے صوفی صافی تھے۔ گمنام پسندی ان کا مسلک اور عزلت گزینی ان کا مشرب اور یہ ہمت خاص اپنے بزرگوں سے ورثے میں پائی تھی۔ حضرت صوفی منیریؒ کا خاندان اپنے حسب و نسب اور دینی خدمات کی وجہ سے بالعموم ہندستان میں اور بالخصوص صوبۂ بہار میں ممتاز ہے۔ آپ کی چوبیسویں پشت میں گلشن رسالت کے ایک ممتاز پھول حضرت امام جعفر صادقؓ کے صاحبزادے حضرت امام محمد دیباجؒ کی ذات بابرکات نمایاں نظر آتی ہے۔ امام محمد دیباجؒ کے متعلق متعدد تذکروں اور نسب ناموں میں تحریر ہے کہ "آپ حضرت امام جعفر صادقؓ کے پانچویں صاحبزادے تھے۔ یہ خلیفہ منصور کے عہدِ خلافت میں زیادہ مشہور ہوئے۔ اولاد امام حسینؓ ہونے کے سبب مقبولیت اور عوام کی توجہ زیادہ ہوئی تو خلیفہ منصور کو اپنی خلافت سے اندیشہ ہوا اس نے ملزم قرار دے کر آپ کو زندہ دیوار میں چنوا دیا تو آپ کے صاحبزادے حضرت سید جعفر نیشاپوریؒ مع اہل و عیال ملک خراسان چلے آئے۔ پھر یہ خاندان نیشاپور منتقل ہو کر متوطن ہو گیا[1]

جب یہ خاندان نیشاپور منتقل ہوا تو پھر آپ کی اولاد میں سے حضرت سید السادات علیم الدین گیسو دراز دانشمند نیشاپوریؒ تقریباً ۷۴۰ھ میں یعنی حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کے عہد میں بہار تشریف لائے اور حضرت مخدوم جہاںؒ سے مرید ہوئے اور اجازت و خلافت سے نوازے گئے۔ سید علیم الدین گیسو دراز دانشمند نیشاپوریؒ کے بڑے

---

[1] کنز الانساب مصنفہ کبیر الدین ص۴۳، ذریعہ دولت مرتبہ ڈاکٹر طیب ابدالی ص۱۷۳ ۔

صاحبزادے حضرت سید محمد فردوسیؒ کی شادی حضرت مخدوم شاہ بدر الدینؒ بدر عالم زاہدی میرٹھی کی بیٹی ولیہ کاملہ حضرت بی بی ابدالنؒ سے ہوئی اسی نسبت سے آپ کی اولاد ابدالی کہی جاتی ہے۔[1]

حضرت سید علیم الدینؒ کے اخلاف و اولاد صوبہ بہار میں بود و باش اختیار کر کے رشد و ہدایت انجام دیتے رہے۔ حضرت صوفی منیریؒ کا ننہالی خاندان بھی اپنی عظمت و بزرگی کی وجہ سے ہندستان اور خاص کر صوبہ بہار میں ممتاز رہا ہے اس لئے کہ فاتح بہار حضرت امام محمد تاج فقیہ کے بڑے صاحبزادے حضرت اسرائیلؒ کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت اسرائیل کے پوتے اور دنیائے تصوف کے درخشندہ ستارے حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحیٰی منیریؒ ہیں جن کی بڑی صاحبزادی بی بی فاطمہؒ کی اولاد میں سے حضرت صوفی منیری ہیں۔ غرض کہ حضرت صوفی منیریؒ کا ددھیال اور ننہیال خاندانی حسب و نسب، بزرگی اور تقدس اور عظمت و شہرت کے اعتبار سے صوبہ بہار میں ممتاز رہا اور ہے۔

آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۹ء میں اپنے ننہیال قصبہ منیر شریف ضلع پٹنہ میں ہوئی۔ مادۂ تاریخ ولادت مظہر حق ہے۔ آپ کے والد حضرت سید شاہ محمد علی ابدالیؒ کا سایہ ۱۲۶۰ھ میں سر سے اٹھ گیا۔ اس وقت آپ کی عمر صرف سات برس کی تھی۔ آپ کے ماموں حضرت شاہ اعظم علی عرف بیکن منیریؒ نے آپ کو اور آپ کے بڑے بھائی، ایک بہن اور آپ کی والدہ ماجدہ کو مستقل طور پر منیر شریف منتقل فرما دیا تھا۔ آپ کی تعلیم و تربیت اپنے ماموں کے زیر سایہ ہوئی۔ آپ کی شادی صوبہ بہار کے مشہور صوفی خانوادہ اور خانقاہ اسلام پور کے سجادہ نشین حضرت سید شاہ ولایت علی ہمدانی کی صاحبزادی سے ہوئی۔[2]

---

[1] حضرت صوفی منیریؒ کے نثری کارنامے مصنفہ ڈاکٹر محمد طیب ابدالی ص۳۲ ۔ [2] آپ کے خسر حضرت شاہ ولایت علی ہمدانی کی ولادت ۱۲۱۶ھ میں اور وفات ۱۳۰۰ھ میں ہوئی۔ آپکے خسر شاہ ولایت علیؒ خانقاہ اسلام پور کے سجادہ نشین تھے۔ نویں صدی میں دیوان شاہ حبیب اللہ قادری اور سید اعظم علی ہمدانی کی مسند سجادگی کا اسلام پور میں ثبوت ملتا ہے آپ اپنے نانا حضرت ہدایت علی بلخی کے مرید و مجاز اور سلسلہ ابو العلائیہ کے مشہور بزرگ مخدوم شاہ یحییٰ علی لعل آبادی کے مجاز و خلیفہ تھے۔ نظر محبوب میں شاہ محمد اکبر ابو العلائی داناپوری نے لکھا ہے کہ "حضرت شاہ ولایت علی قدس سرہٗ اپنے عصر کے یگانہ و بے مثل تھے"۔ تذکرۃ الابرار مصنفہ شاہ محمد واجد میں تحریر (باقی بر صفحہ ۱۳۱)

شادی کے بعد فارسی اور عربی کی کامل دستگاہ مولوی حسام الدین حیدر اور مولوی فیض اللہ پشاوری سے اسلام پور ہی میں حاصل کی۔ آپ اپنے بڑے بھائی حضرت سید شاہ اولاد علیؒ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور اجازت و خلافت سے نوازے گئے پھر حضرت نے اپنا جانشین بنایا۔ حضرت صوفی منیری کو اپنے بزرگان سلاسل سے غایت عقیدت تھی کتب بینی کا اس قدر شغف تھا کہ حضرت مخدوم جہاں کی تمام تصانیف اور ملفوظات کو اپنی خوش خط تحریر میں نقل کیا ہے اور اسی جذبے نے آپ کو تصنیف و تالیف کی طرف مائل کر دیا۔ تصوف کی طرف آپ کا فطری میلان تھا۔ اس لئے آپ نے تصوف کی متعدد نثری اور شعری تصانیف لکھی ہیں جن سے آپ کے سنجیدہ اور گہرے علمی مذاق، ادبی ذوق اور سلیقۂ تحریر کا پتہ چلتا ہے۔ اردو نثر میں آپ کی متعدد تصانیف خراج عقیدت حاصل کر چکی ہیں جس کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) راحتِ روح ——— ایک تمثیلی داستان ہے جس میں صوفیانہ خیالات کو پیش کیا گیا ہے۔ مقفیٰ و مسجع عبارت میں ہے۔ غالب دہلوی کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے لکھا تھا لیکن ان کا انتقال ہو گیا تھا اس کے بعد مکمل ہوئی۔ اس کو دوسری مرتبہ راقم الحروف نے ایڈٹ کر کے زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔

(۲) وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت ——— بزرگان سلسلۂ فردوسیہ کے حالات میں یہ پہلا تذکرہ ہے جو اردو زبان میں لکھا گیا۔

(۳) خط راست ——— یہ تصنیف ایک خط کے جواب میں ہے جو عقائد پر لکھی گئی ہے۔ ابھی تک قلمی ہے۔

(۴) العروۃ الوثقیٰ ——— یہ تصنیف ایمان و عقائد پر ہے مگر نامکمل رہ گئی اس لئے کو مصنف کی زندگی نے وفا نہ کی۔ یہ بھی میرے کتب خانہ کی زینت ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۳۰ گزشتہ) ہے کہ "مخدوم یحییٰ علی کے خلفاء میں شاہ ولایت علی ممتاز تھے" تذکرہ ابو نجیب صفحہ ۷۵ میں ہے کہ "حضرت شاہ ولایت علی اسلام پوری قدس سرہٗ و مرقدہٗ جو سلسلۂ منعمیہ کے مشائخ اور صوبہ بہار میں تیرہویں صدی کے بزرگوں میں عارف کامل شیخ گزرے ہیں۔" انوار ولایت مؤلفہ حضرت عبد القادر اسلام پوری میں ان کی تفصیلی حالت ہے۔

حضرت صوفی منیریؒ کو اللہ تعالےٰ نے فکری دولت اور شاعرانہ مزاج ودلیت کیا تھا اور پھر آپ کا ماحول بھی شاعرانہ تھا۔ آپ کے نانا زاد بھائی جوشش منیری بھی شاعر تھے اور وہ عبدالغفور نساخ سے شورۂ سخن کرتے ان کی خواہش تھی کہ آپ بھی نساخ سے اصلاح سخن لیتے۔ آپ نے اسے قبول نہ کیا اس لئے کہ آپ کو ایک ایسے استاد فن کی تلاش تھی جو یگانہ روزگار ہو اور اس فن میں ایسی دستگاہ رکھتا ہو جو دوسروں کے لئے نارسا ہو۔ اس عہد میں غالب کی شخصیت شعراء کی صف میں لعل شب چراغ کی تھی اور چونکہ صوفی منیریؒ بھی انفرادیت پسند تھے اور مخدوم جہاں کے پیر حضرت نجیب الدین فردوسیؒ سے سلسلۂ بیعت کی وجہ سے روحانی وابستگی تھی۔ دلی کو ماویٰ وملجا سمجھتے تھے اسی لئے آپ نے غالب دہلوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور آپ نے ۲۲ ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ کو قصبہ منیر شریف سے تین مثنویاں لوامع الحمد، کشش عشق، روشن عشق، ایک فارسی قصیدہ اور عریضۂ تلمذ غالب دہلوی کی خدمت میں بذریعہ ڈاک دہلی روانہ کیا۔ غالب نے آپ کے کلام پر اصلاح شروع کرنے سے پہلے "الامر فوق الادب" لکھ کر اپنے حسن ادب کا اظہار کیا اور بعض اشعار پر دو دو صاد بنائے اور جواب میں حضرت صوفی منیری کو پیر و مرشد سے خطاب کر کے خط لکھا۔ غالب نے جن اشعار پر صاد بنایا ہے ان میں سے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں تاکہ صوفی منیریؒ کے کلام کی عظمت واضح ہو۔ اس شعر پر غالب نے دو صاد بنائے ہیں ؎

نورِ حق جلوہ ربِ شانِ الٰہ　　ہے تو بندہ مگر اللہ اللہ　　صص غالب
حسرتِ دید بس نکل جائے　　دل سے دل کی ہوس نکل جائے　　ص ،،
جی دیا ہم نے مدعا نہ ملا　　خوں بہا اور خوں بہا نہ ملا　　ص ،،
دل کو چاک جگر سے راہ ہوئی　　بے قراری قرار گاہ ہوئی　　ص ،،
غم دیں تھا نہ فکرِ دنیا تھی　　محویت جی میں کار فرما تھی　　ص ،،
کاش ہو دل میں عاشقی کا گھر　　سب کے جی میں ہو کاش اسکا گزر　　ص ،،

مذکورہ بالا مثنوی کے اشعار پیش کرنے کی غرض وغایت یہ ہے کہ اس سے صوفی منیریؒ کی قادر الکلامی اور غالب کی پسندیدگی پر روشنی پڑ سکے۔

صوفی منیریؒ عملی طور پر صوفی تھے اور مسندِ سجادگی پر متمکن۔ اس نے صوفیانہ خیالات کو آپ نے تجربے کی روشنی میں پیش کیا ہے ان کے اشعار ان کے واردات قلبی اور مشاہدات کے آئینہ دار ہیں۔ یہ دو اشعار ملاحظہ ہوں ؎

لاکھوں دنیا میں ہیں زہاد و عباد والے | کہیں دو چار ہی نکلیں گے محبت والے
باتیں اچھی ہیں برائی ہے تو بس اتنی ہے | نیک اپنے کو سمجھتے ہیں نصیحت والے

سرابِ حقیقت کا بھی انداز نرالا ہے اور عشق کا بھی انداز انوکھا ہے۔ صوفی منیریؒ کے دو اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

قدم بوسی تیری کرتا زمینِ آستاں ہو کر | خجل ہے آسماں قسمت سے ہی آسماں ہو کر
اٹک کر رہ گئے زہاد ہم بچ کے چل نکلے | گئی ہے راہ کوئے یار کی باغ جناں ہو کر

صوفی منیریؒ کی غزل کے چند اشعار میں جس میں صوفیانہ خیالات کو دلکش پیرائے میں پیش کیا ہے ؎

دل کی دی ہے خبرِ حشرِ محبت مجھ کو | وصلِ جنت ہے جہنم تیری فرقت مجھ کو
نہ ثواب اس میں وفا اور نہ بے اعراض گناہ | شرک اس راہ میں ہے غیر کی الفت مجھ کو
تیرے قدموں سے ہوا مجھکو قیامت کا یقین | پھر دکھا بہر خدا جلوۂ قامت مجھ کو
کر دے آباد میرے گھر کو اب اے جلوۂ حسن | کر دیا ہے سینۂ عشق نے غارت مجھ کو
دل افسردہ خیالوں سے بہل جاتا ہے | کم نہیں بت کدہ سے گوشۂ عزلت مجھکو

دارِ فانی کی کوئی چیز نہیں لینے کی
لینی ہوتی تو پسند آتی تھی عزت مجھ کو

صوفی منیریؒ کے اشعار میں کیف و کم بھی ہے اور عشق کی سرمستی بھی۔ ان کے اشعار تصوف کی کیفیت میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن تغزل کی ہم آہنگی بھی ہے۔ حضرت صوفی منیریؒ کی غزل کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں جس میں تصوف کی مختلف کیفیات کی زنگارنگی ہے ؎

حاصل ہے میرے اشک کا طوفاں کہیں جسے | سایہ ہے وہ میرا شبِ ہجراں کہیں جسے
اے رشکِ مہر جلوہ تیرا ہے نگاہ سوز | پردہ تیرا ہے عارضِ تاباں کہیں جسے

مجھ کو جو مدتوں پہ قفس سے رہا ہوا　　صبحِ وطن ہے شامِ غریباں کہیں جیسے
خوگر ہوں مشکلوں کا امیدِ وصال میں　　دشوار مجھ پہ ہے وہی آساں کہیں جیسے
خوش ہوں جنوں سے میں کہ نہ کرتے ہیں التفات　　ہے صبحِ عید چاک گریباں کہیں جیسے
سعیِ طلب میں سرمہ کروں چشمِ شوق کا　　وہ ایک غبارِ راہِ بیاباں کہیں جیسے
جلوہ کو تیرے حشر کا کیوں انتظار ہے　　جلوہ ترا ہے حشر کا ساماں کہیں جیسے

صوفی بتائے منزلِ جاناں کی راہ کون
اب چپ ہے وہ حریں دلِ نالاں کہیں جیسے

حضرت صوفی منیریؒ کا وصال ۶ ذی قعدہ ۱۳۱۹ھ میں خانقاہ اسلام پور میں ہوا اور وہیں سپردِ خاک کئے گئے۔ آپ کا مزار مرجعِ خلائق ہے۔ آپ کی مسندِ سجادگی پر آپ کے چھوٹے صاحبزادے حضرت سید علی علیہ الرحمہ جلوہ افروز ہوئے جو حضرت سید شاہ ایوب ابدالیؒ اسلام پوری کے والد و مرشد ہیں۔

حضرت شاہ محمد اکبر داناپوریؒ

حضرت امام تاج فقیہ کی اولاد اپنی عظمت و بزرگی کی وجہ سے صوبہ بہار کی ہر قدیم خانقاہ سے نسبت رکھتی ہے۔ حضرت شاہ اکبر داناپوری بھی حضرت امام تاج فقیہ کے چھوٹے صاحبزادے حضرت عبدالعزیزؒ کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ حضرت سید شاہ محمد سجاد ابن سید شاہ تراب الحق موڑوی ابن قطب وقت حضرت طیب اللہ نقاب پوشؒ (موڑہ تالاب متصل بہار شریف) کے صاحبزادے تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء کو شہر آگرہ کے محلہ نئی بستی میں ہوئی۔ اس وقت آپ کے حقیقی چچا سید شاہ محمد قاسم داناپوریؒ عدالت عالیہ آگرہ میں ایک خدمت پر مامور تھے۔ آپ کی والدہ آپ کو لے کر حضرت سیدنا امیر ابوالعلاء رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر حاضر ہوئیں اور ان کے دین و دنیا کی ترقی اور کامیابی کے لئے دعا گو رہیں۔ بچپن ہی سے صوفیانہ مزاج تھا اور بزرگان دین سے کافی شغف اور لگاؤ تھا۔ آپ اپنے چچا حضرت شاہ محمد قاسم داناپوریؒ کے دست حق پرست پر سلسلہ ابوالعلائیہ میں بیعت ہوئے۔ ۱۲۸۱ھ میں آپ کو اجازت و خلافت سے بھی سرفراز کیا گیا۔ آپ چونکہ صوبہ بہار کے مشہور صوفی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے۔ اس لئے تصوف سے فطری لگاؤ تھا۔ آپ کے خاندان کے اکثر و بیشتر افراد بھی شاعر تھے۔ اس لئے بچپن ہی سے صوفیانہ شاعری کا ماحول ملا۔ آپ آتش کے شاگرد رشید وحید الہ آبادی سے اصلاح سخن لیتے رہے اور اس میں کمال حاصل کیا۔ اکبر الہ آبادی بھی وحید الہ آبادی کے شاگرد تھے۔ استاد کو ان دونوں شاگردوں پر فخر تھا۔ حضرت اکبر داناپوری عملی طور پر صوفی باصفا تھے اس لئے آپ کی شاعری میں بھی تصوف کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر کلیم احمد عاجز اپنے تحقیقی مقالہ میں اس طرح

رقم طراز ہیں :

"اکبر داناپوری صرف صوفی شاعر ہی نہیں، صوفی مسلک ہی نہیں ظاہر و باطن ان کا اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اپنے دور کے صاحب حال بزرگوں میں سے تھے۔ ان کے عقیدت مندوں کا حلقہ صوبہ بہار سے مغرب میں صوبہ متحدہ اور مشرق میں بنگال کے اکثر اضلاع میں پھیلا ہوا تھا حضرت وحید، آتش کے تلامذہ میں آتش کے صوفیانہ رنگ کو نمایاں کرنے میں سب سے زیادہ کامیاب ہوتے۔ اکبر کے مزاج میں وہی عناصر تھے جو فقر و توکل، قلندریت، استغنا کو تقویت بخشتے ہیں۔ مزید بر آں اکبر عشق و معشوق حقیقی کی مستی اور سرشاری سے بھی نوازے گئے تھے۔ اس لئے جناب اکبر کے یہاں یہ دو آتشہ رنگ ہے۔"[1]

شاہ اکبر داناپوری صوفی شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں حقائق و معارف کا گہرا امتزاج ہے اسی کی روشنی میں آپ کے کلام کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مسلک علم تصوف کے بڑے اہم مسائل ہیں۔ آپ نے اس پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وہ خود ہیں عین اشیا اور اشیا عین ہیں اس کی
اٹھا پردہ تعین کا تو وحدت کیا ہے کثرت کیا

آفتاب ذات کے آگے صفت کا کیا وجود　　سامنے خورشید کے جگنو کبھی چمکا نہیں

ہم ہیں کچھ اور ہی شئے اپنی حقیقت کچھ اور　　خاک کیا نور کسے کہتے ہیں جوہر کیسا
کونسا ذرہ ہے کہ نہاں نہیں جس میں خورشید　　ہم کو ہر قطرہ سمندر ہے، سمندر کیسا

اس بیان کو تغزل کی آمیزش نے اور بھی دلکش اور دلچسپ بنا دیا ہے ؎

---

[1] تحقیقی مقالہ از ڈاکٹر کلیم عاجز ص ۲۱۳-۱۴ (مخطوطہ)

دیکھیں خوش ہو کے نہ کیوں آپ تماشا اپنا　　آئینہ اپنا ہے، عکس اپنا ہے، جلوہ اپنا

مظاہر خداوندی ہر جگہ ہے پردے میں بھی اور پردے سے باہر بھی۔ اسی کو ھُوَالظَّاھِرُ وَھُوَ الْبَاطِنُ کہتے ہیں۔ اس خیال کو اس طرح پیش کیا ہے ؎

تو ہے پوشیدہ ہر اک پردے میں اور ہے عیاں بھی　　جلوہ آتا ہے نظر ظاہر و پنہاں تیرا

مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ پر اس طرح کاربند ہیں ؎

اکبرؔ رضائے دوست کا امیدوار ہوں　　خواہاں نہ فلک کا ہوں نہ طالب نعیم کا

اور یہ دو اشعار بھی تصوف کے اہم نکات کی نشاندہی کرتے ہیں اور قابل توجہ ہیں ؎

کی نظر اپنی حقیقت پر تو ظاہر یہ ہوا　　یہ وہی قطرہ ہے اک روز جو دریا ہوگا

نقش اگر ہے تو ہے نقاش کا ہونا بھی ضرور　　انجمن ہے تو کوئی انجمن آرا ہوگا

آپ کا وصال ۱۳۲۲ھ میں۔ اناپور میں ہوا اور آپ کا مزار مبارک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

آپ کی ایک عارفانہ غزل کے چند اشعار بھی ہدیۂ قارئین ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

غزل

ہم تری راہ میں مٹ جائیں گے سوچا ہے یہی　　درد مندانِ محبت کا طریقہ ہے یہی

آپ ہوں پیش نظر روح جو تن سے نکلے　　اے مری جان مری آنکھوں کی تمنا ہے یہی

کوچۂ یار میں کھو جانے کو ہم آئے ہیں　　راستہ مرحلۂ عشق کا سیدھا ہے یہی

بحرِ ذخارِ محبت کی نہیں ملتی تھاہ　　جس میں ہم ڈوبنے والے ہیں وہ دریا ہے یہی

غور سے قطرے کی جانب جو نظر کی تو کھلا　　ہم اسے قطرہ غلط سمجھے تھے دریا ہے یہی

دل میں اللہ کا گھر، آنکھوں میں حضرت کی جگہ　　میرا کعبہ ہے یہی، میرا مدینا ہے یہی

ہے توکل مجھے اللہ پر اپنے اکبرؔ　　جس کو کہتے ہیں بھروسا وہ بھروسا ہے یہی

حضور پُر نور حضرت سید شاہ مرشد علی القادری عاصیؒ

صوبہ بنگال اپنی عظمت و حکمت کی وجہ سے دیارِ ہند کا ممتاز صوبہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ بزرگانِ دین کی محبت و اخوت کا مرکز ہے۔ پانچویں صدی ہجری سے یہاں صوفیائے کرام کا ورود مسعود ہوا اور ان کے رشد و ہدایت اور فیضان کا سلسلہ جاری ہوا۔ سنار گاؤں، پنڈوہ، بیر بھوم جیسے خطے میں بزرگانِ دین کی تعلیمات اور صلح و آشتی کے پیغام کی روشنی پھیل رہی تھی۔ صوبہ بہار سے حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ جیسے عظیم المرتبت بزرگ سنار گاؤں ہی میں ۶۶۸ھ میں حصولِ تعلیم اور اکتسابِ فیض کے لئے حضرت شرف الدین ابو توامہؒ کی خدمت میں آئے اور کامیاب گئے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اپنے مرید و خلیفہ حضرت اخی سراج کو سعد آباد پورا اور پنڈوہ رشد و ہدایت کے لئے بھیجا۔ آپ کے مرید و خلیفہ حضرت علاؤ الحق پنڈوی کی عظمت و بزرگی کا شہرہ ہندوستان گیر طور پر ایسا ہوا کہ جونپور (یوپی) سے حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانیؒ آپ سے مرید ہونے کیلئے آئے اور مرید ہو کر بامراد واپس ہوئے اور رشد و ہدایت میں مشغول ہو گئے۔ حضرت حسام الدین مانکپوریؒ کو بھی اسی خانقاہ کی غلامی کا شرف حاصل ہے۔ حضرت پیر بدرِ عالم زاہدیؒ بھی دہلی اور جونپور سے آ کر چاٹگام جیسے خطے کو نورِ ایمان سے منور کیا اور بہار شریف جا کر رشد و ہدایت میں مشغول ہو گئے۔ حضرت مخدوم جہاںؒ کے صاحبزادے مخدوم ذکیؒ اور چھوٹے بھائی مخدوم حبیب الدین فردوسیؒ کو بیر بھوم کی ولایت نصیب ہوئی۔ صوبہ بنگال دسویں صدی ہجری تک اپنے فیوض و برکات اور رشد و ہدایت کے باعث ہندوستان میں صوفیوں اور بزرگوں کے رشد و ہدایت اور تعلیم ظاہری و روحانی کا ایک اہم مرکز تسلیم

کیا جاتا رہا لیکن رفتہ رفتہ ان کی خانقاہوں سے رشد و ہدایت کی روشنی پھیلنی بند ہوگئی تو اللہ تعالےٰ نے رشد و ہدایت کیلئے غوث پاک حضرت محبوب سبحانی عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے حضرت سید شاہ عبداللہ الجیلی رحمۃ اللہ علیہ کو صوبہ بنگال کے خطہ منگل کوٹ میں ۱۱۰۰ھ میں بھیجا۔ یہ خطہ ابھی تک ظلمت و گمراہی سے تاریک تھا۔ اس میں نورِ ایمان اور رشد و ہدایت کی ضرورت تھی۔

حضرت سید شاہ عبداللہ الجیلیؒ حضرت غوث پاک کی اولاد میں پندرہویں[۱۵] پشت میں ہیں جیسا کہ نسب نامہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ حضرت غوث پاک کے حکم اور بشارت کے بموجب رشد و ہدایت کے لئے سرزمین بنگال میں تشریف لائے اور منگل کوٹ میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ کے ساتھ آپ کے صاحبزادے حضرت سید شاہ ذاکر علی القادریؒ ولایت پناہ حضرت سید شاہ روشن علی القادریؒ اور ان کے صاحبزادے حضرت سید شاہ طفیل علی القادریؒ بھی تھے۔ منگل کوٹ میں آپ نے اشاعت دین اسلام اور سلسلہ قادریہ اور رشد و ہدایت کا سلسلہ قائم کیا اور اس خطہ کو نورِ ایمان سے منور کیا۔ جب حضرت موصوفؒ کو اپنے مشن میں کامیابی ہو گئی تو اپنے صاحبزادے حضرت سید شاہ ذاکر علی القادریؒ کو اپنا نائب اور سجادہ نشین بنا کر عازمِ حج بیت اللہ ہوئے اور فریضۂ حج کے بعد آپ دیارِ حبیب خدا میں ہمیشہ کے لیے آرام فرما ہوئے۔ آپ کی نیابت آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت سید شاہ ذاکر علی القادریؒ[۱] کر ہی رہے تھے کہ آپ کے وصال کی خبر ملی اور مسند سجادگی پر جلوہ افروز ہوئے اور با ضابطہ ایک مسجد اور خانقاہ کی بنیاد رکھی۔ منگل کوٹ میں اب سلسلۂ قادریہ کی ایک ایسی خانقاہ قائم ہوئی جو بے سہاروں کے لئے سہارا اور مضطرب دلوں کے لئے سکون کا سامان بنی۔ اس خانقاہ سے نہ صرف تبلیغِ اسلام اور رشد و ہدایت کا فیضان جاری ہوا بلکہ علوم ظاہری و باطنی کی تعلیم بھی ہوتی رہی۔ حضرت موصوف کا وصال ۱۱۹۴ھ میں منگل کوٹ میں ہوا اور

---

[۱] تذکرہ قطب العالمین مصنفہ محمد ضیاء الرحمٰن۔

وہیں آپ آسودہ ہیں۔ آپ کا مزار مبارک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

آپ کے بعد آپ کے برادر زادہ اور داماد حضرت سید شاہ طفیل علی القادریؒ[۱] ابن حضرت سید روشن علی القادریؒ آپ کی مسند سجادگی پر رونق افروز ہوئے۔ آپ اکثر سفر کی صعوبتیں جھیل کر بنگال کے مختلف خطوں میں جا کر اشاعت اسلام اور توسیع سلسلہ کے فرائض انجام دیتے رہے جس کے سبب بنگال کے مختلف خطوں میں آپ کے سلسلے کی وسعت ہوئی اور بنگال کا اکثر و بیشتر علاقہ آپ کے فیضان سے روشن ہوا۔ آخر آپ ۱۲۵۱ھ میں اپنے معبود حقیقی سے جا ملے اور اپنے عم بزرگوار کے پہلو میں منگل کوٹ میں مدفون ہوئے۔ مزار مبارک مرجع خلائق ہے۔ حضرت سید شاہ طفیل علی القادریؒ کے وصال کے بعد آپ کے منجھلے صاحبزادے حضرت سید شاہ مہر علی القادریؒ ملقب بہ اعلیٰ حضور زیب سجادہ قادریہ ہوئے اور آپ نے بحکم غوث پاک حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ منگل کوٹ سے منتقل ہو کر اپنی نانیہال مدنی پور میں مستقل سکونت اختیار کی اور وہاں تشنگان علم و معرفت کی سیرابی کیلئے ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی جس کی شہرت دور دور تک ہوئی۔ آپ کا وصال ۱۲۸۵ھ میں ہوا اور مدنی پور میں آپ آسودہ ہیں۔ آپ کا مزار مقدس فیض و برکت کا سرچشمہ ہے۔ حضور پرنور حضرت سید شاہ مرشد علی القادریؒ اسی خاندان علم و معرفت کے چشم و چراغ ہیں۔

حضرت سید شاہ عبدالقادر المعروف بہ سید شاہ مرشد القادری ملقب بہ حضور پرنور تخلص بہ عاشق قدس سرہٗ حضرت اعلیٰ حضور سید شاہ مہر القادریؒ کے بڑے صاحبزادے اور جانشین ہیں۔ آپ کی ولادت باسعادت ۲۷ رمضان المبارک ۱۲۶۶ھ کو مدنی پور بنگال میں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد حضرت اعلیٰ حضور کے زیر نگرانی ہوئی تعلیم کا زیادہ شغف بڑھا تو آپ نے مولانا عطاء الرحمٰنؒ اور مولانا ابوالفرحؒ سے تحصیل علوم کیا۔ آپ اپنے والد حضرت مہر القادریؒ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور اجازت و خلافت

---

[۱] Al Qaudri order in Bengal By Dr. S.S.M.A. Khorasani

سے نوازے گئے۔ آپ کو تصنیف و تالیف کا بھی شغف تھا اس لئے آپ کے کئی رسالے مختلف موضوعات پر مخطوط کی شکل میں محفوظ ہیں البتہ ایک ضخیم اردو دیوان زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر شرفِ قبولیت حاصل کر چکا ہے۔

اگرچہ آپ کی زبان عربی اور فارسی تھی لیکن اردو میں بھی کافی مہارت رکھتے اور اردو کے شاعر تھے۔ جلال لکھنوی چونکہ زبان و بیان کے مشہور شاعر تھے اس لئے آپ نے ان ہی سے اصلاحِ سخن لیا۔

آپ صوفیٔ باصفا کے ساتھ ساتھ صوفی شاعر بھی تھے۔ عشقِ رسول میں اتنی فنائیت اور محویت تھی کہ تصوف کی تعلیم فنافی الرسول پر عمل تھا۔ اس لئے آپ کے کلام میں عشقِ حقیقی کے ساتھ ساتھ عشقِ رسول کی بھی جلوہ آرائی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

ازل سے وہ جمالِ پاک حسنِ لایزالی ہے　　　جلالِ حسنِ محبوبِ خدا شانِ جلالی ہے

جلال اور جمال کے کیف آگیں خیال کو کتنے دلکش پیرایہ میں پیش کیا ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار میں تصوف کے اسرار و رموز کو کتنی ایمائیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں ؎

اے قلزمِ حیا میری شرمِ گناہ سے　　　دریا نہیں بنا عرقِ انفعال کب

گلشن میں نہیں وہ گلِ رعنا کئی دن سے　　　بیچینی میں ہے بلبلِ شیدا کئی دن سے

فیضِ قدمِ پاک سے اے قبلہ کونین　　　ہے قلب مرا خانہ کعبہ کئی دن سے

نہیں حسنِ عمل رکھتا یہ عاصی　　　بھروسہ ہے فقط مولیٰ تمہارا

حضرت عاصیؔ کی اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو اپنے استاد جلال لکھنوی کی فرمائش پر لکھی تھی ؎

اس جلے دل کی نہ لی تو نے خبر چھوڑ دیا　　　ایسے دل سوز کو اے داغِ جگر چھوڑ دیا

دل کہیں جان کہیں میں ہوں سا دم مرگ کہیں　　　ساتھیوں نے مجھے ہنگامِ سفر چھوڑ دیا

ہائے کہنا دلِ بیتاب کا یہ پہلو میں　　　عرش سے لا کے محبت نے کدھر چھوڑ دیا

آپ کا وصال ۱۱ شوال ۱۳۶۱ھ میں جودھپور میں ہوا اور وہیں آرام فرما ہیں۔ آپ کا مزار مبارک فیوض کا سرچشمہ ہے

حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں صاحب فاضل بریلویؒ

دنیائے تصوف کے حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں صاحبؒ تابندہ ستارے تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۰ شوال المکرم ۱۲۷۲ھ میں بریلی میں ہوئی۔ آپ کا تاریخی نام المختار تھا اور تخلص رضاؔ۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت مولانا نقی علی خاں صاحب اپنے وقت کے مشاہیر علماء میں سے تھے۔ آپ کی تعلیم و تربیت والد بزرگوار ہی کے زیر سایہ ہوئی۔ ذہانت و ذکاوت کی وجہ سے بہت جلد درسی کتابوں سے فارغ التحصیل ہوئے۔ علم فلسفہ اور ہیئت میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ سندِ احادیث مکہ معظمہ کے اکابرین علماء سے بھی حاصل کی۔ آپ نے خانقاہ مارہرہ کے مشہور بزرگ اور صاحبِ سجادہ حضرت سید شاہ آلِ رسول علیہ الرحمۃ کے دست حق پرست پر بیعت فرمائی اور سندِ خلافت سے بھی نوازے گئے۔ حضرت کے تبحرِ علمی کا شہرہ نہ صرف ہندستان تک ہی رہا بلکہ عالم انسانی میں پھیلتا رہا۔ آپ بے شمار کتابوں کے مصنف و مولف ہیں۔ فتاوائے رضویہ آپ کی مشہور تصنیف ہے جس سے آپ کے تبحرِ علمی اور علوم دینیہ میں دقتِ نظری کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کا ترجمہ قرآن مجید منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ آپ کا وصال ۲۵ صفر المظفر ۱۳۴۰ھ میں اپنے وطن مالوف بریلی (یوپی) میں ہوا۔ آپ کا مزار مبارک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

حضرت احمد رضا خاں صاحبؒ اگر ایک طرف عالم متبحر، صوفی باصفا، مجدد وقت کی حیثیت سے مشہور ہیں تو اردو شاعر کی حیثیت سے بھی آپ کا مرتبہ کم نہیں۔ اردو شاعری میں نعت گوئی کو جو عروج و کمال حاصل ہے وہ آپ ہی کا مرہونِ منت ہے۔ آپ کی نعت میں عشقِ رسول کے ساتھ ساتھ جو والہانہ انداز ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ نعت رسول میں جس ادب و احترام کے ساتھ آپ زمزمہ سنج ہوتے ہیں اور جس اخلاص و عقیدت کے ساتھ بارگاہِ نبوی میں اپنے وارداتِ قلبی،

کیفیتِ روحانی اور جذبِ دروں اور سوز دروں کا ہدیہ پیش کرتے ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

آپ کے مسلکِ تصوف میں وحدت الوجود کے مسئلہ کو اہمیت حاصل ہے[1]۔ اور یہ اکابرینِ صوفیہ کا مسلک رہا ہے۔ یہ مسئلہ اس قدر پیچیدہ رہا ہے کہ اہلِ علم نے اس پر مختلف انداز سے روشنی ڈالی ہے لیکن پھر بھی اس کی گتھی سلجھ نہ سکی بلکہ اس کی سرحد مسئلہ قضا و قدر کو چھو لیتی ہے۔ اس لئے خاموشی ہی بہتر ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صوفیائے کرام نے اور صوفی شعراء نے اس کو دلکش پیرایہ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت امام احمد رضا خاں نے بھی فنا و بقا، تسلیم و رضا، صبر و توکل، وحدت الوجود جیسے دقیق مسائلِ تصوف کو شعری قالب میں ڈھالا ہے اور یہ آپ کی کامیابی کی بین دلیل ہے۔

حضرت امام احمد رضا خاں صاحبؒ کا کمالِ فن ہے کہ تصوف کے مسائل دقیقہ کی توضیح کے بجائے عشقِ رسول کی سرمستی میں اپنے کو گم کرتے ہیں اور جب عشقِ رسول میں سرشاری ہوتی تو عرفانِ الٰہی کا آگہی ہوتی اور یہ لوت گوئی نہ صرف طریقت و حقیقت کی سرحد چھو لیتی ہے بلکہ اس میں دلکشی اور جاذبیت پیدا کرتی ہے۔ ایک نعتیہ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں	تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں
یہ چراغِ مزار پر قدسی	کیسے پروانہ وار پھرتے ہیں
ہائے غافل وہ کیا جگہ ہے جہاں	پانچ جاتے ہیں چار پھرتے ہیں
کوئی کیوں پوچھے تیری بات رضا	تجھ سے کتنے ہزار پھرتے ہیں[2]

مذکورہ بالا اشعار میں کتنے کیف و کم ہیں، لیکن نعتیہ انداز ہے۔ مندرجہ ذیل غزل ذوق و شوق اور والہانہ کیف و سرور کی ترجمان ہے ؎

کس بلا کی مے سے ہیں سرشار ہم	دن ڈھلا ہوتے نہیں ہشیار ہم
دشمنوں کی آنکھ میں بھی پھول تم	دوستوں کی بھی نظر میں خار ہم
فصلِ گل، سبزہ، صبا، مستی، شباب	چھوڑیں کس دل سے درِ خمار ہم

---

[1] المیزان بمبئی ص ۳۵۱ احمد رضا نمبر [2] المیزان بمبئی، امام احمد رضا نمبر ص ۲۷۰۔

میکدہ چھٹتا ہے اللہ ساقیا　　اب کی ساغر سے نہ ہوں ہشیار ہم [۱]

حضرت امام احمد رضا کا یہ شعر بھی اپنی لطافت و صداقت کے اعتبار سے کتنا بالیدہ ہے اور تصوف کے کیسے مسائل اس ایک شعر کی توضیح کے لیے پردہ میں ملاحظہ ہوں۔

آہ وہ آنکھ کہ ناکامِ تمنا ہی رہی　　ہائے وہ دل جو ترے در سے پُر ارماں گیا

حضرت امام احمد رضا خاں صاحب کی ایک غزل پیشِ خدمت ہے جس میں اخلاق و تصوف اور حسن و عشق کا جذبہ تعینات کی سرحدوں سے آگے نکل جاتا ہے۔[۲]

یاد میں جس کی نہیں ہوشِ تن و جاں ہم کو　　پھر دکھا دے وہ رخ اے مہرِ فروزاں ہم کو

جس تبسم نے گلستاں پہ گرائی بجلی　　پھر دکھا دے وہ ادائے گلِ خنداں ہم کو

تنگ آئے ہیں دو عالم تیری بیتابی سے　　چین لینے دے تپِ سینۂ سوزاں ہم کو

نیرِ حشر نے اک آگ لگا رکھی ہے　　تیز ہے دھوپ ملے سایۂ داماں ہم کو

چاکِ داماں میں نہ تھک جائیو اے دستِ جنوں　　پرزے کرنا ہے ابھی جیب و گریباں ہم کو

پردہ اس چہرۂ انور سے اٹھا کر اک بار　　اپنا آئینہ بنا اے مہِ تاباں ہم کو

اے رضا وصفِ رخِ پاک سنانے کے لیے
نذر دیتے ہیں چمن مرغِ غزل خواں ہم کو

---

[۱] المیزان ص۱۴۹ ۔ [۲] حدائقِ بخشش حصہ اول ص۵۶

حضرت سید شاہ ولی مرشد القادریؒ المتخلص بہ مرشد

آپ کا اسم شریف ولی مرشد القادریؒ اور لقب چھوٹے حضور ہے۔ آپ حضرت سید شاہ مہر علی القادریؒ کے خلفِ اصغر ہیں آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۷۴ھ میں خانقاہ مہر یہ قادریہ مدنی پورہ (مدنا پور) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد اعلیٰ حضورؒ کے زیر نگرانی ہوئی۔ مزید تعلیم اپنے عہد کے مشاہیر علمائے کرام سے حاصل کی۔ تکمیلِ تعلیم ظاہری کے بعد تعلیم باطنی کی طرف راغب ہوئے اور تعلیم طریقت و حقیقت اپنے والد کے ہاتھوں مکمل ہوئی۔ اکتسابِ فیوضِ روحانی کے بعد سلسلہ قادریہ میں مرید ہوئے اور اجازت و خلافت سے سرفراز کئے گئے۔ والد ماجد کے وصال کے بعد خانقاہ مذکور میں رشد و ہدایت اور ترویج سلسلہ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ دور دور سے تشنگانِ علم و معرفت آپ کی خدمت میں آتے اور سیراب ہو کر جاتے۔ آخر ۱۳۱۵ھ میں آپ کا وصال ہوا اور وصیت کے مطابق اپنے پیر و مرشد حضرت اعلیٰ حضورؒ کے پائیں میں مدفون ہوئے۔ آپ کا مزار مبارک مرجع خلائق ہے۔

آپ کو اردو زبان و ادب سے والہانہ لگاؤ ہے اگرچہ آپ کے جدامجد کی زبان عربی تھی۔ تصنیف و تالیف بھی آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ اردو میں متعدد تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔ آپ کو اردو شاعری سے فطری لگاؤ تھا چنانچہ اس کا بین ثبوت دیوانِ حافظ کا منظوم اردو ترجمہ ہے جو مخطوطہ کی شکل میں کتبخانہ خانقاہ کی زینت ہے۔

آپ اردو کے صوفی شاعر تھے اور تخلص مرشد۔ تصوف سے لگاؤ فطری اور خاندانی تھا۔ آپ کو شاعری میں اپنے بڑے بھائی حضرت عاصیؔ سے شرف تلمذ حاصل تھا جس کا اظہار خود وہ اس طرح کرتے ہیں۔ ؎

حضرتِ عاصیؔ کو جو غزلیں دکھا لیتے ہیں ہم   ہے مُبرا عیب سے مرشد خطا سے پاک ہے

عزیز گرامی قدر سید شاہ ظلال مرشد القادری سلمہٗ جو حضرت کے نواسے ہیں انہوں نے نمونہ کلام بھیجا ہے ان ہی میں سے پیشِ خدمت ہے ؎

جلوہ گر شب کو اگر وہ مہِ کنعاں ہو گا   رخِ روشن سے خجل مہ تاباں ہو گا

میری گردن کی جا کوچۂ جیلاں ہو گا   بعد مرنے کے یہ اللہ کا احساں ہو گا

عندلیبانِ چمن اپنا گلا کاٹیں گے   نغمہ زن باغ میں جب وہ گلِ خنداں ہو گا

ہم جو امید وفا رکھتے ہیں محبوبوں سے   بزمِ عالم میں نہ ہم سا کوئی ناداں ہو گا

اے مسیحا علاج کیا ہو گا   دردِ دل جب کہ لا دوا ہو گا

ہم غریبوں کا یار دنیا میں   کوئی پرسانِ حال کیا ہو گا

یا الٰہی وہ دن کب آئیں گے   پاس اپنے جو دلربا ہو گا

وقتِ بد میں شریک اے مرشدؔ   یار ہو گا نہ آشنا ہو گا

مذکورہ بالا اشعار تغزل کے بھی غماز ہیں اور تصوف کے بھی ترجمان۔ زبان و بیان کی چاشنی بھی اس میں کیفیت پیدا کرتی ہے۔

حضرت سید شاہ سید علی کامل اسلام پوریؒ

حضرت سید شاہ سید علی کاملؔ اسلام پوریؒ کا خاندان علم و فضل اور بزرگی و درویشی کے اعتبار سے صوبہ بہار میں شہرت و عظمت کا حامل ہے۔ آپ حضرت امام جعفر صادقؓ کے صاحبزادے امام محمد دیباجؓ کی اولاد میں سے ہیں اور آپ کے نانا حضرت سید شاہ ولایت علی ہمدانی ابو العلائیؒ خانقاہ اسلام پور کے سجادہ نشیں تھے۔ جن کا نسب نامہ پدری امیر کبیر حضرت سید علی ہمدانی مبلغ کشمیر تک منتہی ہوتا ہے اور نسب نامہ مادری حضرت مخدوم جہاں شرف الدین یحیٰی منیری اور آپ کے سجادہ نشیں حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید بلخیؒ برادر زادہ حضرت مولانا مظفر بلخیؒ تک پہنچتا ہے۔ اس اعتبار سے آپ خاندانی حیثیت سے علم و فضل اور تقویٰ و طہارت کے گہوارے میں پلے۔

آپ حضرت فرزند علی صوفی منیریؒ کے فرزند اصغر اور جانشیں ہیں اور میرے والد محترم حضرت سید شاہ ایوب ابدالی نیرؔ اسلام پوریؒ کے والد محترم اور پیر و مرشد ہیں۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲ صفر ۱۲۹۵ھ میں اپنی نانیہال اسلام پور میں ہوئی اور آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے والد حضرت صوفی منیریؒ سے ہوئی۔ علوم دینیہ کی تعلیم حضرت مولانا حکیم سید محمد رفیق قادری ابو العلائیؒ[1]

---

[1] حضرت مولانا حکیم حاجی سید محمد رفیق قادری ابو العلائی ابن سید فدا علیؒ کا وطن موضع شہباز پور علاقہ چین پور ضلع پٹنہ تھا۔ آپ نے مولانا آل احمد صاحب پھلواری سے تحصیل علوم کیا اور آپ ہی سے سند حدیث حاصل کی۔ علم فقہ اور علم طب کی تعلیم مولانا حکیم سید غلام دستگیر سے پائی۔ آپ نے دونوں اساتذہ کرام سے ۱۲۸۹ھ میں سند فراغت حاصل کر لیا اور اپنے عہد کے مشہور صاحب فیض بزرگ حضرت سید شاہ (باقی بر صفحہ ۱۴۸)

سے ہوئی اور جب مزید شغف بڑھا تو آپ کانپور تشریف لے گئے اور وہاں کے یگانۂ روزگار عالم دین مولانا احمد حسن کانپوریؒ سے حدیث و فقہ کی تعلیم کی تکمیل کر کے ان سے سند حدیث حاصل کی۔

(بقیہ ص ۱۴۷ سے آگے) ابوالعلائی سجادہ نشین خانقاہ اسلام پور کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور اجازت و خلافت سے نوازے گئے۔ آپ فنافی الشیخ تھے کہ پیر و مرشد کی زندگی میں جن بزرگوں نے بھی آپ میں جوہر کامل دیکھ کر اجازت و خلافت دینی چاہی آپ نے اسے قبول نہ کیا اور جواب میں آپ ہمیشہ یہی فرماتے۔

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیال ما ہے ۔ چہ کنم کہ نفس بد خو نکند بکس نگاہے

"یک در گیر محکم گیر" کے اصول پر عمل کرتے رہے۔ اپنے پیر کے آستانے کی محبت میں اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر اسلام پور ہی کو اپنا ماویٰ و ملجا اور وطن بنایا۔ اپنے پیر زادگان اور رئیس اسلام پور شاہ اکرام الدین احمد عرفانی اسلام پوری کی تعلیم و تدریس میں مشغول رہے جب آپ کے پیر و مرشد کا وصال ۱۳۰۸ھ میں ہو گیا تو آپ پر ایک عجیب کیفیت طاری رہی تقریباً آٹھ سال بعد جب سکون حاصل ہوا تو سفر حج کے لیے ۱۳۰۹ء میں روانہ ہو گئے۔ وہاں آپ کو حضرت مولانا عبدالحق مہاجر مکیؒ، حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا عبد الرحمان سراج مکی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت سید امین الدین رحمۃ اللہ علیہ بن علامہ رضوان شیخ الدلائل مدرس حرم نبوی اور حضرت شیخ عبد الجلیل بن عبد السلام سجادہ مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے ۱۳۱۰ھ میں مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ میں سند حدیث حاصل ہوئی اور مختلف وظائف کی بھی اجازت ملی۔ نیز اجازت و خلافت سے بھی نوازے گئے۔ آپ عربی زبان و ادب کے ماہر تھے۔ آپ کا فیضان بہت دور دور تک پہنچا۔ آپکا وصال ۱۷ ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ میں پٹنہ میں ہوا اور اسلام پور میں اپنے پیر و مرشد کے مقبرے میں مدفون ہوئے۔ آپ کے مسندِ سجادگی پر آپ کے صاحبزادے حضرت حکیم محمد یٰسین علیہ الرحمۃ رونق افروز ہوئے اور آپ کے بعد تمام مریدین و معتقدین نے راقم الحروف کے والد حضرت ایوب ابدالی رحمۃ اللہ علیہ کو اصرار کر کے آپ کے مسندِ سجادگی پر بٹھایا۔ حضرت ایوب ابدالی رحمۃ اللہ علیہ کو تعلیم و ارشاد آپ سے ملی اور اجازت و خلافت سے بھی نوازا تھا۔ حضرت موصوف نے احسن طریقہ رشد و ہدایت کو تاحیات انجام دیا۔ آپ کا وصال ۱۹۶۷ء میں ہوا۔

تعلیم دینی کی تکمیل کے بعد تعلیم روحانی کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے والد حضرت سید شاہ فرزند علی صوفی منیریؒ کے دست حق پرست پر سلسلۂ فردوسیہ میں بیعت ہوئے۔ آپ کے پیر و مرشد نے ریاضت و مجاہدہ اور اذکار و اشغال میں اس طرح مشغول کیا کہ اسی کے ہو کر رہ گئے کہ کچھ اپنی بھی خبر نہ رہی۔ گمنامی کا لبادہ اوڑھ کر اپنی بزرگی کو اس میں چھپائے رکھا۔

حضرت کو شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا اور اپنے والد حضرت صوفی منیریؒ کی زندگی ہی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ لیکن اتنے پوشیدہ طور پر کہ والد کو بھی خبر نہ ہوتی۔ بلکہ ایک کیفیت آپ پر ایسی طاری ہوئی کہ سب کو منیر شریف کے تالاب میں جا کر غرقاب کر دیا۔ پھر اپنے والد کے وصال کے بعد ان کے شاگرد رشید حضرت عرفان اسلام پوری سے مشورہ سخن لیا۔ آپ کی شاعری میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا مسلک تصوف میں بڑا اہم ہے۔ حضرت نے اس اہم نکتہ کو بڑے دلکش پیرایے میں پیش کیا ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

جس دل میں ترا گھر نہ ہو وہ دل خراب ہے	جو دل ہے محو یاد وہی کامیاب ہے
ہر شے میں گو ہے اس کی تجلی عیاں مگر	یہ غایت ظہور خود اس کا حجاب ہے
ہے مثل آفتاب عیاں بھی نہاں بھی ہے	عارض پر تیرے فرط تجلی نقاب ہے
ہم میں وہ جلوہ گر ہے مگر دیکھیں کس طرح	اپنا وجود ہیچ تو سراسر حجاب ہے

مذکورہ بالا اشعار میں حضرت کامل اسلام پوری نے ہمہ اوست اور ہمہ از وست کو اپنے شعری پیکر میں کس دلکشی اور کیف کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت کامل اسلام پوری کی جتنی غزلیں ہیں سبھی میں ان کے واردات قلبی اور مشاہدات کی جلوہ سامانیاں ہیں۔ مزید ایک غزل پیش خدمت ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

پھر وہ رشک گل تر یاد آیا	پھر وہ منظور نظر یاد آیا
حیف اس دل پہ جسے کو اے دوست	جز ترے کوئی اگر یاد آیا
بعد مدت کے چلے ہیں ناوک	آج پھر میرا جگر یاد آیا
اس کے سینے کو بھی ہم ہیں تیار	کچھ ستم اور اگر یاد آیا

کعبہ یا دیر ہو شیدا کو ترے ہر جگہ تیرا ہی در یاد آیا
کچھ بھی یاد اب دلِ کامل میں نہیں تو جو یاد آیا اگر یاد آیا

آپ کا وصال ۶ ر جمادی الاول ۱۳۶۴ھ میں خانقاہ اسلام پور میں ہوا۔ آپ کا مزار مبارک مرجعِ خلائق ہے۔

حضرت شاہ محسن ابوالعلائی داناپوری رحمۃ اللہ علیہ

آپ حضرت شاہ محمد اکبر داناپوری کے فرزند ارجمند اور جانشین تھے۔ آپ کا نام محسن اور تخلص بھی محسن تھا۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۰ ربیع الثانی ۱۲۹۸ھ میں داناپور میں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم والد ہی سے ہوئی۔ مزید حصولِ تعلیم کے لئے آپ الہ آباد گئے وہاں مدرسہ احیاء العلوم میں زیرِ تعلیم رہے اور وہیں سے فارغ التحصیل ہوئے۔ آپ کے اندر ابتدا میں سیاسی شعور بھی تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں پٹنہ میں مولانا شوکت علی اور سر علی امام بیرسٹر کی قیادت میں جب انجمن حفاظت المسلمین کا سہ روزہ جلسہ ہوا جس میں ہندستان کے اکابر سیاسی رہنما شریک ہوئے تھے تو پہلے دن جلسہ کے صدر باتفاقِ آرا حضرت محسن داناپوری منتخب کئے گئے۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد دنیاوی عز و جاہ سے کنارہ کش ہو کر ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہو گئے اور اپنے والد ماجد حضرت سید شاہ محمد اکبر داناپوریؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے اور اجازت و خلافت سے نوازے گئے۔ بعد ۱۶ رشعبان ۱۳۲۷ھ کو آپ اپنے والد حضرت شاہ اکبر داناپوریؒ کے وصال کے بعد مسندِ سجادگی پر رونق افروز ہوئے۔

آپ فطری شاعر تھے۔ قدرت نے آپ کو ذوقِ سلیم عطا فرمایا تھا۔ آپ اپنے والد شاہ اکبر داناپوریؒ سے اصلاحِ سخن لیتے رہے۔ آپ چونکہ سلسلہ ابوالعلائیہ کے صاحب سجادہ تھے جس کی تعلیم میں عشقِ حقیقی کی لپٹ اور درد و سوز کی آنچ ہے۔ اس لئے حضرت محسن کی شاعری میں بھی حقیقت و معرفت کے وہ تمام کوائف ہیں جن سے سالک دوچار ہوتا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مسلک کو شاعر نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

آئینہ سامنے رکھ کر یہ تماشا دیکھا　　اپنی صورت میں ترے حسن کا جلوہ دیکھا
وہی عارف ہے وہی صوفی خدا ہے محسن　　جس نے قطرے میں ہی دریا کا تماشا دیکھا

اور ان اشعار میں حقائق کی جھلک دیکھئے۔ وحدت الشہود کے مسلک کو شاعرانہ انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

جمالِ یار ہر سو جلوہ گر ہے　　جدھر دیکھا وہی پیشِ نظر ہے
کبھی آنکھوں میں وہ نورِ نظر ہے　　کبھی دیکھا تو دل میں جلوہ گر ہے

عشق کی بھی عجیب کیفیت ہوتی ہے اور وہ کہاں کہاں اثرانداز ہوتا ہے اس غزل میں اس رنگ کو دیکھئے ؎

اے دلِ پُرسرورِ من، نازنہ بن، نیاز بن　　ساقیٔ مست ناز کی آنکھوں میں سرفراز بن[1]
دیر و حرم سے درگذر، عاشق کبر دناز بن　　کعبۂ دل میں ڈھونڈھ اسے پردہ کشائے راز بن
جوششِ گریہ تابکے، نالہ مکن مثالِ نَے　　یعنی تو اپنے درد کا آپ ہی چارہ ساز بن
دل میں ہے درد، درد میں مخفی ہے سوز و سازِ عشق　　مطرب خوش نوا بیا، پردہ درِ مجاز بن
خواہش و آرزو کو چھوڑ یعنی خوشی سے منہ نہ موڑ　　نالۂ جاں گداز کر، عاشقِ دل نواز بن
کیف و سرور و بے خودی ساقی کی یاد لے گئی　　آ دلِ غم گسارِ من، ساقیٔ مست ناز بن
آئینۂ علی کو دیکھ، حسن محمدی کو دیکھ　　کر کے نثار جان و تن، عاشقِ سرفراز بن
ہجر کی رات ہو بسر، کیسے بتا تو چارہ گر　　آ وے تصورِ سحر بانگِ شبِ دراز بن
منبعِ نورِ ذات ہے، جلوہ گہِ صفات ہے　　طالبِ حق بیا بیا، خاکِ رہِ مجاز بن
محسنِ دل گرفتہ تو، کر نہ خودی کی گفتگو
بندۂ بے نیاز ہو، اکبرِ پاک باز بن

---

[1] مسلم شعرائے بہار حصّہ چہارم ص ۱۲۹-۱۳۳

حضرت سید شاہ شاہد علی سبز پوش فانی گورکھپوری

حضرت شاہ شاہد علی فانی گورکھپوری کی شخصیت اس اعتبار سے بھی ممتاز ہے کہ آپ مسند ارشاد کے اعتبار سے حضرت آسی غازیپوری کے جانشین اور خانقاہ رشیدیہ کے سجادہ نشین تھے۔ دوسری حیثیت آپ کی یہ بھی ہے کہ آپ فنِ شاعری میں حضرت آسی کے شاگرد ہیں اور پھر آپ کی ہدایت کے مطابق شمشاد لکھنوی سے بھی اصلاحِ سخن لیتے رہے۔

آپ کا اسم شریف شاہد علی اور تخلص فانی ہے۔ ۲۷ ربیع الاول ۱۳۰۶ھ مطابق ۲۰ نومبر ۱۸۸۸ء میں گورکھپور میں آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ کا خاندان علم و فضل اور حسب و نسب کے اعتبار سے قابلِ قدر اور لائقِ احترام ہے۔ آپ کے جدِ اعلیٰ حضرت سید احمد مکیؒ بادشاہ سکندر لودی کے عہد میں نجف اشرف سے ہندستان تشریف لائے اور اجودھیا میں سکونت اختیار کی۔ آپ کے صاحبزادے حضرت میر سید موسیٰ سلطان العاشقینؒ حضرت آفتابِ ہند ظفرآبادیؒ کے مرید اور جلیل القدر خلیفہ تھے اور آپ ہی کی دعا سے شہنشاہِ بابر کو ہندستان کی بادشاہت ملی۔ آپ کی اولاد میں سے چند پشتوں کے بعد حضرت میر سید قیام الدین گورکھپوریؒ اپنے عہد کے مشہور بزرگ حضرت شیخ محمد رشید جونپوری قدس سرہٗ سے مرید ہوئے اور اجازت و خلافت سے نوازے گئے۔ حضرت شاہ شاہد علی انہی کی اولاد میں سے ہیں۔ گورکھپور کی صاحبِ ثروت شخصیتوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ لیکن ان حقیقتوں کے باوجود آپ کا فطری لگاؤ فقیری اور درویشی سے رہا اور آپ حضرت آسی کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے تو دنیاوی جاہ و ثروت سے دل اچاٹ ہو گیا اور اپنے پیر و مرشد کے اس شعر پر عمل پیرا رہے۔ ؎

حرص دولت کی نہ عز و جاہ کی　　بس تمنا ہے دلِ آگاہ کی

علومِ ظاہری کی تکمیل کے بعد علومِ باطنی کی طرف راغب ہوئے۔ اپنے پیرو مرشد کی خدمت اور صحبت میں رہتے اور اسی کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے۔ حضرت آسیؔ نے اپنی زندگی ہی میں آپ کو جانشین نامزد کیا اور تمام سلاسل کی اجازت و خلافت سے نوازا یہاں تک کہ ۱۳۳۲ھ میں حضرت نے آپ کو اپنا قائم مقام بنا دیا اور جب حضرت آسیؔ کا وصال ۲ جمادی الاول ۱۳۳۵ھ کو ہوا تو آپ خانقاہ رشیدیہ کی مسند سجادگی پر فائز ہو کر رشد و ہدایت کے فرائض انجام دینے لگے۔ آخر ۶ ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ مطابق ۷ جولائی ۱۹۵۲ء کو حضرت کا وصال خانقاہ رشیدیہ جونپور میں ہوا اور اپنے بزرگوں کے آستانے درگاہ رشید آباد میں مدفون ہوئے جو آج بھی مرجع خلائق ہے۔

آپ کو شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ حضرت آسیؔ کے شاگرد تھے اور آپ ہی کی ہدایت پر شمشاد لکھنوی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ اس کے ماسوا اردو کے شعرائے کاملین فن سے بھی گہرے تعلقات تھے اور وہ شعرا بھی آپ کو جوہر شناس سمجھتے: چنانچہ بیخودؔ دہلوی، جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی، ریاضؔ خیرآبادی، خواجہ عبدالرؤف عشرتؔ سے گہرے روابط تھے۔ ملاقات کے علاوہ خط و کتابت کا بھی سلسلہ تھا۔ اثیمؔ خیرآبادی جو نسیمؔ خیرآبادی کے صاحبزادے ہیں، انہوں نے دیوانِ فانیؔ گورکھپوری کے دیباچے میں اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا ہے:-

> "چونکہ فطری ذوقِ سخن رکھتے تھے اور صاحبِ کمال ہیں لہٰذا اربابِ کمال کے جویا بھی رہے اور قدرداں بھی۔ خود بھی مختلف جاذبیتیں رکھتے ہیں۔ اربابِ ذوق ان سے آآکر ملتے ہیں۔ خصوصاً منتخبین روزگار جب گورکھپور تشریف لاتے ہیں آپ سے ملے بغیر واپس نہیں جاتے۔" [۱]

حضرت فانیؔ گورکھپوری صوفی باعمل تھے اور اس پر طرہ یہ کہ خانقاہ رشیدیہ کے سجادہ نشین اور عظیم المرتبت صوفی شاعر حضرت آسیؔ غازیپوری کے صحبت یافتہ۔ ان حقائق نے آپ

---

[۱] دیوانِ فانی ص ۲۵ مرتبہ مصطفےٰ علی سبزپوش آسیؔ گورکھپوری۔

کے کلام کو دو آتشہ بنا دیا۔ عشقِ حقیقی کی تڑپ اور وارداتِ قلبی کے اظہار کے ساتھ ساتھ حضرت کے تجربات و مشاہدات نے آپ کی شاعری پر تصوف کے گہرے اثرات ثبت کیے ہیں۔ وہ حقائق و معارف کے رازہائے سربستہ کو اس طرح منکشف کرتے ہیں جیسے ان کے تجربے کی ایک علامت ہو۔ وہ فرماتے ہیں کہ ؎

ظاہر ہے جبکہ شاہد و مشہود ایک ہے　　کیوں غیر بن کے دید کی ہم آرزو کریں

اور عاشقِ کامل کی حقیقت کو اس طرح واضح کرتے ہیں ؎

امتیاز اتنا بھی اب دشوار ہے　　یار، عاشق ہے کہ عاشق، یار ہے

شکر اور تسلیم و رضا بزرگوں کا شیوۂ خاص ہے۔ فانی کے کلام میں اس کی چاشنی دیکھیے ؎

شکوہ نہ بخت کا نہ گلہ روزگار کا　　جس حال میں ہوں شکر ہے پروردگار کا

اور ذرا دستِ کرم اور سائل کے شرم کی مطابقت کو دیکھیے ؎

اے دستِ کرم ہمتِ سائل کی ذرا شرم　　کونین سے بھرتے نہیں دامن دعا کے

فانی کی ایک غزل کے چند اشعار پیش ہیں جن میں تصوف کی دھیمی دھیمی آنچ کے ساتھ زبان و بیان کی بھی لذت ہے۔ ؎

نہاں ہیں دیدۂ ظاہر سے روبرو ہو کر　　وہ دردِ جو ٹھہرے قریبِ رگِ گلو ہو کر

تری تلاش میں کیا خوب ہم نے پھل پایا　　کہ آپ ہو گئے گم گرمِ جستجو ہو کر

شکستہ دل کو نہ چھیڑ نگاہِ لطف سے اب　　یہ چاک اور بھی بڑھ جائے گا رفو ہو کر

نہ پھر سنائے خدا لن ترانیاں ان کی　　کہ شوقِ دید بڑھا اور گفتگو ہو کر

امید و بیم میں فانی عجیب لذت تھی
وہ بات ہی نہ رہی ان سے گفتگو ہو کر

ولی دکنی

ولی دکنی۔ اردو شاعری میں اور بالخصوص صنف غزل میں خصوصی حیثیت کے حامل ہیں۔ صنفِ غزل میں عشق حقیقی اور عشق مجازی کا رنگ ہر شاعر کے یہاں کم و بیش ملتا ہے۔ جس سے اس کی شاعری میں کبھی کبھی صوفیانہ مذاق اور عارفانہ بصیرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن ولی کے یہاں تصوف کے نکات اور طریقت و معرفت کے حقائق اس کثرت سے ملتے ہیں کہ ان کا شمار صوفی شعراء میں ہوتا ہے۔ ولی دکنی گجرات کے مشہور بزرگ حضرت وجیہ الدین گجراتیؒ کے برادر حقیقی حضرت شاہ نصراللہ گجراتی کی اولاد میں سے تھے آپ کے والد کا نام شریف محمد تھا جو ۱۰۷۲ھ میں داغِ مفارقت دے گئے اور ولی بچپن ہی میں باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ ولی کی سنہ پیدائش میں اختلاف ہے۔ مؤلف تذکرۂ شعرائے دکن نے سنہ ولادت ۱۰۷۹ھ لکھا ہے تو کسی نے ۱۰۵۷ھ لکھا ہے تو کوئی سنہ ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۴۹ء کے حق میں ہے۔ ولی گجرات میں پیدا ہوئے ہوں یا احمد آباد میں مگر یہ حقیقت ہے کہ ان کی زندگی کے بیشتر حصے دکن ہی میں کر رہے۔ ولی نے احمد آباد میں حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کی خانقاہ کے مدرسے میں تعلیم پائی اور وہیں حضرت شاہ نورالدین صدیقی سہروردیؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے لکھا ہے کہ:۔

> "ولی دکنی نے احمد آباد میں حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کی خانقاہ کے مدرسے میں تعلیم پائی اور وہیں حضرت شاہ نورالدین صدیقی سہروردی کے مرید ہوئے۔"[1]

ولی ۱۱۱۲ھ مطابق ۱۷۰۰ء میں دلی تشریف لائے تو ان کی ملاقات حضرت شاہ سعد اللہ

---

[1] کلیاتِ ولی مصنفہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ص ۱۱۔

گلشن سے ہوئی وہ آپ کے بڑے معتقد ہوئے اور آپ ہی کی ترغیب و تحریک پر ریختہ میں شعر کہنے لگے۔ دہلی کا یہ سفر اردو دنیا کے لئے بڑا میمون و مبارک رہا۔ ولی نے اردو میں غزلیں، فارسی غزلوں کے روش اور انداز میں کہی اور یہی آپ کی مقبولیت کا ضامن ہوا۔ جب آپ کا دیوان شمالی ہند پہنچا تو اس کی اتنی مقبولیت ہوئی کہ اردو کے دوسرے شعراء نے بھی اس کا تتبع کیا اور ولی اردو غزل کے سالارِ کارواں بنے۔ ولی کا انتقال ۱۱۱۹ھ مطابق ۱۷۰۷ء میں بمقام احمد آباد ہوا اور وہ میں نیلی گنبد کے قریب موسیٰ سہاگ اور شاہی باغ کے درمیان مدفون ہوئے۔[۱]

ولی نے جس زمانے میں اردو شاعری شروع کی اور ان کی شاعری پروان چڑھی وہ ماحول خالص صوفیانہ تھا اور ولی کا خاندان بھی خدا ترسی اور تصوف کے اعتبار سے مشہور تھا۔ اس لئے ان پر خاندان کا بھی اثر تھا، حضرت نور الدین سہروردیؒ سے ارادت کا بھی فیضان تھا حضرت شاہ سعداللہ گلشنؒ کی عقیدت کا بھی ثمرہ تھا اور وہ خود درد مند دل لے کر آئے تھے۔ اس لئے عشقِ حقیقی کی آگ میں تپ رہے تھے۔ اس لئے ولی کی اردو شاعری کو اسی نے دو آتشہ بنایا۔ ولی کی شاعری کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک پہنچتی ہے اور تصوف میں عشقِ مجازی کے بعد ہی عشقِ حقیقی کا درجہ آتا ہے۔ ولی کہتے ہیں ؎

شغل بہتر ہے عشق بازی کا کیا حقیقی کا کیا مجازی کا
ہے ولی عشق ظاہری کا سبب جلوۂ شاہدِ مجازی ہے

ولی نے مندرجہ ذیل شعر میں اخلاق کا سبق کتنے دلکش پیرائے میں دیا ہے ؎

تواضع خاکساری ہی تمہاری سرفرازی ہے حقیقت کی لغت کا ترجمہ عشقِ مجازی ہے

ولی کی نگاہ میں عشق ایک فن عجیب ہے جسے عارف ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ولی کہتے ہیں کہ ؎

---

[۱] مطالعہ ولی مصنفہ ڈاکٹر شارب ردولوی ص۵۳

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے　　کہ فنِ عاشقی عجب فن ہے

ولی کی نگاہ میں عشق سے پاکبازی آتی ہے اور عاشقوں کا شمار پاکبازوں میں ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

پاکبازوں سے یہ ہوا معلوم　　عشق مضمونِ پاکبازی ہے

اگرچہ عشق کے گھونٹ بڑے ترش اور تلخ ہیں اور پھر عشق کسی کو چھوڑتا نہیں ہے۔ ولی اس طرح کہتے ہیں ؎

عشق کے ہاتھ سوں ہوئے دل ریش　　جگ میں کیا بادشاہ کیا درویش

شرابِ عشق کی حقیقت اور اس کی کارفرمائی ولی کے ان اشعار میں دیکھئے ؎

عشق تھا پردۂ تجرید میں سب سے آزاد　　طالبِ عشق ہوا صورتِ انساں میں آ

جو ہوا رازِ عشق سے آگاہ　　وہ زمانے کا فخر رازی ہے

شرابِ شوق سے سرشار ہیں ہم　　کبھی بے خود کبھی ہوشیار ہیں ہم

عاشق کی خصوصیات کو ان اشعار میں ولی نے کتنے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ ؎

معرکے میں عشق کے مرِ بوالہوس کا کام نیں　　دیکھ حالت کیا ہوئی منصور سے سردار کی

پایا ہوں ولی سلطنتِ ملکِ قناعت　　اب تخت و چتر میرے لئے ارض و سما ہے

فنا اور بقا، تصوف کے اہم تعلیم ہیں۔ جب تک انسان اپنی ذات کو خدا میں فنا نہ کر دے گا وہ بقا کا مقام نہیں پا سکتا۔ اس خیال کو ولی کس خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں ؎

عشق میں لازم ہے اول ذات کو فانی کرے　　ہو فنا فی اللہ دائم ذات یزدانی کرے

مظاہر خداوندی کو شاعر نے بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جلوہ گری تو ہر جگہ ہے۔ نقاب اور حجاب میں بھی اس کا حسن کیسے چھپ سکتا ہے۔ وہ کہتے

ہیں ؎

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

ڈاکٹر شارب ردولوی ولیؔ کے سلسلے میں اپنی تصنیف میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں :۔

"بحیثیت ایک صوفی شاعر کے ولیؔ ایک خاص اہمیت کے مالک ہیں۔ اس زمانے کے مزاج میں تصوف رچا بسا ہوا تھا، اخلاق اور فکر پر وہی چھایا ہوا تھا، تصوف ہی علمیت اور بلند مذاقی کا معیار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ولیؔ نے بڑی خوبی اور کامیابی کے ساتھ تصوف کے مسائل کو اشعار کا جامہ پہنایا ہے۔ ان کے صوفیانہ خیالات صرف غزل کے اشعار تک ہی محدود نہیں بلکہ مثنویوں میں بھی اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔" [۱]

ولیؔ کی شاعری میں فنا اور بقا، عرفانِ الٰہی، توکل و قناعت، وحدت الوجود، عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی غرض کہ تمام صوفیانہ خیالات کی جلوہ گری ہے اس لئے صوفی شاعر کی حیثیت سے ان کا مقام بلند ہے۔ ان کے دل کی کیفیتیں ان کے تجربے کی علامت ہیں۔ ولیؔ کی یہ صوفیانہ غزل اس حقیقت کی ترجمان ہے ؎

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسنِ بے حجاب اسکا — بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا
ہوا ہے مجھکو شمعِ بزم یک رنگی سوں یو روشن — کہ ہر ذرے اُپر تاباں ہے دائم آفتاب اس کا
کرے عشاق کوں جیوں صورتِ دیوار حیرت سوں — اگر پردے سوں وا ہووے جمالِ بے حجاب اس کا
سجن نے یک نظر دیکھا نگاہِ مست سوں جسکوں — خرابات دو عالم میں سدا اں ہے وہ خراب اس کا
مرا دل پاک ہے از بس ولیؔ زنگِ کدورت سوں
ہوا جیوں جوہرِ آئینہ مخفی پیچ و تاب اس کا [۲]

---

[۱] مطالعہ ولیؔ، مصنفہ ڈاکٹر شارب ردولوی صفحہ ۴۵ [۲] کلیاتِ ولیؔ مرتبہ مارہروی صفحہ ۱۲ غزل ۱۰

سراج اورنگ آبادی

اردو شاعری میں جس طرح دکن کو اپنی قدامت کی وجہ سے تفوق حاصل ہے اسی طرح اسے صوفیانہ شاعری میں بھی تقدم اور برتری حاصل ہے۔ ولی دکنی کی نیابت کا سہرا سراج اورنگ آبادی ہی کے سر جاتا ہے۔

سید سراج الدین نام، سراج تخلص اور اورنگ آباد (دکن) وطن ہے۔ آپ کی ولادت ۱۱۲۸ھ مطابق ۱۷۱۵ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں ہوئی جو اس عہد کا مرکز علم و فن تھا۔ ابھی تحصیلِ علم ہی میں مشغول تھے کہ آپ پر جذب کی کیفیت طاری ہوئی۔ اس وقت آپ بارہ برس کے تھے۔ مجذوب ہو کر برہنہ سر اور برہنہ تن گھومتے رہتے تھے۔ اس عہد کے ایک مشہور بزرگ حضرت شاہ عبدالرحمٰن صاحب سے جب مرید ہوئے تو یہ جذبی کیفیت دور ہو گئی لیکن وجد و کیف کا غلبہ رہا اور ہفتہ میں ایک روز محفلِ سماع منعقد کرتے تھے اور کیف و سرور کی کیفیت سے گزرتے تھے۔ آپ کے پیر بھائی عبدالرسول خاں تھے جن کی ترغیب اور خاطر سے ریختہ میں شعر کہنے لگے جس کو عبدالرسول خاں جمع کر لیا کرتے تھے۔ پھر مرشد ہی کے حکم سے شعر گوئی ترک کر دی اور بڑے ابتلا و آزمائش میں مبتلا ہوئے اور بالآخر ۱۱۷۷ھ مطابق ۱۷۶۳ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

سراج صوفی اور اہل درد میں سے تھے۔ غزلوں میں بھی وہی انداز پایا جاتا ہے۔ میر تقی میر اور میر حسن نے اپنے تذکروں میں لکھا ہے کہ سراج سید حمزہ دکنی کے شاگرد تھے لیکن کلام سے اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی ہے۔ سراج کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ دکن میں رہتے ہوئے بھی ان کے کلام میں سلاست، صفائی اور سادگی ہے۔ دکن میں انہیں ولی کا جانشین تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے ولی کی ہم طرح غزلوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام میں تغزل کا گہرا رنگ

ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شکر اللہ ان دنوں تیرا کرم ہونے لگا ۔۔۔ شیوۂ جور و ستم فی الجملہ کم ہونے لگا
صلح کا پیغام بھیجا اب غنیمِ سحر نے ۔۔۔ لشکرِ غم ہر طرف سب یک قلم ہونے لگا
جب گیا تو سیر کوں بیخود ہوئے اہلِ چمن ۔۔۔ سب طرف سیں سجدۂ نقشِ قدم ہونے لگا

عشقِ حقیقی کی لذت سراج کے دل سے پوچھئے ؎

عشق میں اول فساد درکار ہے ۔۔۔ دل سیں ترکِ ماسوا درکار ہے

سراج کے کلام میں تصوف کے نکات بھی ہیں اور غزل کا کیف و کم بھی وہ ایک مجذوب صوفی تھے۔ اس لئے تصوف کے رازہائے سربستہ کو افشا کرنے میں لذت محسوس کرتے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

ہماری آنکھوں کی پتلیوں میں ترا مبارک مقام ہے گا
پلک کے پٹ ہم نے کھول دیکھے تو عین ماہِ تمام ہے گا
اے شرابِ خرد کے کسی کا نہ کر تو دعویٰ پختہ مغزی
مے محبت کا جام پیا تو کر اب تلک ظرف خام ہے گا
سراج اس شعلہ رو میں ہرگز گلہ روا ہے نہ عاشقوں کو
تمام جلتی ہے شمع ہر شب عبث پتنگوں کا نام ہے گا[1]

سراج کی مشہور غزل صوفیانہ خیالات سے کس قدر لبریز ہے ملاحظہ ہو ؎

خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی ۔۔۔ نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
شہِ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی ۔۔۔ نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی
چلی سمتِ غیب سیں اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا ۔۔۔ مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی
نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سیں بیاں کروں ۔۔۔ کہ شرابِ صبح آرزو خمِ دل میں تھی سو بھری رہی
وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا ۔۔۔ کہ کتابِ عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی تیوں ہی دھری رہی
ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سیں عیاں ہوا ۔۔۔ کہ نہ آئینے میں جلا رہی نہ پری کی جلوہ گری رہی
کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کو ۔۔۔ نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

---

[1] انتخاب سراج اورنگ آبادی ص ۳۰ مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

مرزا محمد علی فدوی

یہ حقیقت ہے کہ درانی حملے کے بعد دلی کی جو تباہی اور بربادی ہوئی اس کے پیش نظر شعرائے دلی نے اپنی عزت و آبرو کی بقا کے لئے اور پھر اقتصادی زبوں حالی کو دور کرنے کے لئے اپنی نظریں دوسری جگہوں پر ڈالیں۔ ان میں ایک طرف لکھنؤ تھا تو دوسری طرف عظیم آباد۔ غرض کہ دبستانِ دلی کے شعراء نے ہجرت کی۔ مرزا محمد علی فدوی بھی ان میں سے ایک ہیں۔

مرزا محمد علی نام، عرف بھجو اور تخلص فدوی تھا۔ احمد شاہ بادشاہ کے یہاں وقائع نویسی کے عہدے پر مامور تھے۔ آپ کی پیدائش کے بارے میں ڈاکٹر سید محمد حسنین کا خیال ہے کہ سنہ ۱۱۴۲ھ تا سنہ ۱۱۵۲ھ میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ ثاقب عظیم آبادی نے لکھا ہے کہ حضرت عشق کے ساتھ سنہ ۱۱۶۲ھ میں عظیم آباد آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ فدوی صوفیانہ مزاج رکھتے تھے اس لئے آپ حضرت عشق کے حلقۂ ارادت میں آئے اور زانوئے تلمذ بھی ان ہی کے سامنے تہہ کیا۔ اپنے پیر و مرشد حضرت عشق کے اتنے شیدائی تھے کہ ان کے دامن سے اس طرح وابستہ ہوئے کہ مر کر بھی ان سے الگ نہ ہوئے اور انہی کے حلقۂ مزار میں مدفون ہوئے۔

فدوی اردو شاعری میں ایک بلند مقام کے مالک ہیں ان کی شاعری میں داخلیت بھی ہے اور خارجیت بھی۔ حضرت عشق کے فیضِ صحبت سے انہوں نے عشق حقیقی کی تڑپ پائی۔ مجاز میں حقیقت کو ڈھونڈا۔ سوز و گداز کی لپیٹ نے ان کی شاعری کو دو آتشہ بنا دیا۔ اگرچہ آپ کے کلام میں صوفیانہ رنگ کا گہرا امتزاج نہیں ہے پھر بھی حضرت عشق کے فیضِ تربیت نے آپ کو بہت کچھ دیا۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین اپنے تحقیقی مقالہ میں لکھتے ہیں :۔

"عشق ہیں تارک الدنیا ہو کر جب معرفت و حقیقت کی بنیاد ڈالی تو استاد

کی اس عظیم تبدیلی سے مرزا فدوی نے بھی بڑا گہرا اثر قبول کیا۔ انہوں نے عشق کے عارفانہ رنگ کی تقلید کی جس کے تانے بانے خواجہ میر درد سے ملتے ہیں مرزا فدوی کے اس رنگ کے کچھ اشعار دیکھئے:۔ [۱]

نظیر دنیا میں کون تیرا تجھے کوئی دے مثال کس کی
تیرے مقابل کسی کو کیجئے یہ جان کس میں مجال کس کی

زبان پر نام ہے ہر آن تیرا
الٰہی شکر ہے احسان تیرا

نیرنگی تری وجہ پریشاں نظری ہے
ہر شئے میں جدی شان نئی جلوہ گری ہے

اور ان دو اشعار میں ہمہ اوست کے فلسفہ کو کس دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے

ہے نقشہ کس سے حق کے سوا ممکنات کا
ہر فرد ہے جہاں میں آئینہ ذات کا

پر تو نہیں تجلیٔ وحدت کا کس پہ یاں
لیکن بیان کس سے ہو اس واردات کا

فدوی نے اپنی ایک غزل میں بھی صوفیانہ خیالات کو اس طرح پیش کیا ہے

ہے چشم سے منظور تو دیدار ہے تیرا
کچھ کام زباں سے ہے تو اقرار ہے تیرا

ہو جان بدن میں تو فدا ہونے کو تجھ پر
سینے میں رہے دل تو گرفتار ہے تیرا

آنکھوں میں جگہ ہے تو تصور ہی کو تیرے
ہے دل میں بھرا کچھ تو یہاں پیار ہے تیرا

---

[۱] مرزا محمد علی فدوی ان کا عصر، حیات اور شاعری مصنفہ ڈاکٹر سید محمد حسنین ص ۲۰۲۔

شاہ کمال الدین حسین چشتی

کمال الدین حسین نام، شاہ کمال چشتیہ عرف اور کمال تخلص ہے۔ یہ قادر نواز خاں کے فرزند ہیں۔ شاہ کمال کے والد کا وطن موضع محی الدین پور متصل دلویرہ ضلع گیا ہے۔ اسی موضع میں شاہ کمال پیدا ہوئے۔ پیدائش کا سن معلوم نہیں ہے۔ البتہ شاہ کمال دلوروی کے ملفوظات جس کے جامع جمال حسین فردوسی ہیں اس مخطوطے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کمال حسین شاہ کمال علیؒ کے فن شاعری میں شاگرد تھے۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ "تذکرۂ ہندی" میں ان کے تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کی نشو و نما عظیم آباد میں ہوئی۔ جب آپ کے والد کا انتقال ہو گیا تو سولہ سال کی عمر میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور قصبہ سیلون پہنچے۔ (آج کل وہ ضلع رائے بریلی کا سب ڈویژن ہے) اور پیر شاہ کریم عطا فرزند و جانشین حضرت پیر شاہ اشرف قدس سرہٗ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو کر بیعت سے مشرف ہوئے اور درویشانہ حالت میں سیر و سیاحت کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ اس وقت سے اب تک اسی شہر میں مقیم ہیں اور متوکلانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ راجہ بھولاس رائے نے آپ کو سات برس سے اپنے مکان میں ٹھہرا لیا ہے اور آپ کی خدمت کو وہ باعثِ سعادت سمجھتے ہیں اور آپ سے بخوبی پیش آتے ہیں۔ چونکہ شاہ کمال کو شعر و سخن سے طبعاً شوق ہے اور بچپن ہی سے آپ کی موزوں طبیعت کو اس کی فکر دامن گیر ہے اسی لئے آپ نے اساتذہ سلف و حال کے دیوان تیس سے زائد جمع کر لئے ہیں اور ان کے کلام کی سیر کی برکت اور کاملوں کے فیض صحبت سے پایۂ اعتبار حاصل کر لیا ہے۔ ابتدا میں اپنا کلام محمد قائمؔ کو دکھاتے تھے اور اب قلندر بخش جراتؔ سے مشورۂ سخن لیتے ہیں۔ آپ کے اخلاق درویشانہ ہیں اور طبیعت

مرنج ومرنجاں واقع ہوتی ہے۔ اکثر فقیر کے مشاعرے میں شریک ہوتے ہیں اور اس خاکسار کے کلام سے دلی الفت رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے میرے تینوں دیوانوں کو اپنے ہاتھ سے نقل کرلیا ہے۔ میرے تذکرۂ ہندی کو جو تیار ہوچکا ہے، خریداروں کے پاس لے گئے۔ غرض کہ جس طرح آپ کا نام کمال ہے آپ کی ذات کمال مجسم ہے۔ اس وقت آپ کی عمر تیس سال سے زیادہ ہوگی۔ نمونہ کلام تذکرۂ ہندی سے ماخوذ ہے۔ ے

میں بندہ کیوں نہ ہوں اس کی ادا کا — عیاں اس بت میں ہے جلوہ خدا کا
ہم گدا دیکھتے ہیں اس بت گمراہ کی راہ — یعنی آ نکلے تو کچھ مانگ لیں اللہ کی راہ

کھولے آنکھیں وقتِ آخر بھی ترا بیمار ہے — مرتے مرتے بھی اسے کیا حسرتِ دیدار ہے

شبِ وصال میں جب روزِ غم کی بات چلی — خروشِ مرغِ سحر نے کہا کہ رات چلی
کچھ اور لے نہ چلے ہم تو اس جہاں سے کمال — ہمارے ساتھ فقط اک خدا کی ذات چلی

شیخ غلام یحییٰ حضور عظیم آبادی

آپ کا اسم شریف غلام یحییٰ، عرف کجو اور تخلص حضور تھا۔ آپ شاہ محمد مظہر کے صاحبزادے اور محمد باقر کے بھتیجے تھے۔ آپ کی ولادت عظیم آباد میں ہوئی۔ لیکن سالِ ولادت کا ابھی تک پتہ نہ چل سکا۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچا محمد باقر عظیم آبادی سے حاصل کی۔ علوم عربی و فارسی میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ صرف و نحو کے بھی ماہر تھے ذریعہ معاش تجارت تھا لیکن اپنی عمر کے آخری حصہ میں طبابت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔

آپ کو تصوف سے گہری دلچسپی تھی اس لئے کہ آپ کا گھریلو ماحول بھی صوفیانہ تھا۔ آپ سلسلۂ چشتیہ میں بیعت تھے مگر کس کے حلقۂ ارادت میں آتے یہ معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن اتنی حقیقت ضرور ہے کہ آپ عظیم آباد کے ایک صاحب سلسلہ بزرگ تھے۔ ۱۱۹۰ھ میں ایک مثنوی بعنوان "مثنوی در تعریف درگاہ شاہ ارزاں" لکھی۔ اس کے علاوہ سلسلۂ منعمیہ ابوالعلائیہ کے ایک مشہور صاحب سلسلہ بزرگ حضرت شاہ رکن الدین عشق قدس سرہٗ (متوفی ۱۲۰۳ھ) سے بھی انہیں کافی عقیدت تھی آپ نے حضرت عشق کے وصال پر ایک قطعہ تاریخ وفات بھی لکھا تھا جو ان کے مزار پر کندہ ہے ؎

امام زماں رکن دین کز وجود   بُبائے جہاں آب و تاب طریقت
گزشت از جہان و بتاریخ و نقش   رقم ساختم آفتاب طریقت

شورش عظیم آبادی کے بیان کے مطابق آپ نے شاعری میں میر[۱] باقر حزیں[۲] کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں :

"شاعر اہلِ مقدور شیخ غلام یحییٰ حضور، ساکن عظیم آباد مرد لیست صاحب

نمکین و مزاج گرفتہ الحال اوقات بسوداگری بسری برد۔ در طبابت شاگرد میر علی اسماعیل ستمند نور مرقدہٗ و در فن شعر شاگرد میر باقر حزیں غفرلہٗ اما باعث کاروبار دنیاوی فکر شعر گاہ گاہ می نماید۔" [1]

آپ کا وصال ۷ رجادی الثانی ۱۲۰۶ھ کو بوقت نماز جمعہ ہوا اور عظیم آباد ہی میں مدفون ہوئے۔

حضور کا تعلق چونکہ ایک صوفی خانوادہ سے تھا اور وہ خود بھی ایک صاحب سلسلہ بزرگ تھے۔ اس لئے اسلامی تصوف سے آپ کو گہری واقفیت تھی اسی لئے آپ کی شاعری میں حقیقت و معرفت کے نکات ملتے ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

یہ دل ہی جلوہ گاہ ہے اس خوش خرام کا دیکھا تو صرف نام ہے بیت الحرام کا
معنی میں لفظ ایک ہے یہ رب و رام کا حاصل یہ ہے کہ ہے وہی حاصل کلام کا
دیکھا تو سب حقیقت و معنی میں ایک ہیں صورت میں گرچہ فرق ہے آپس میں نام کا
اس لامکاں کا کوئی معین نہیں مکاں گر ہے تو دل ٹھکانا ہے اس کے مقام کا

حضور کے اشعار میں تصوف کے مصطلحات بھی آتے ہیں لیکن وہ بھی پردہ ہی پردہ میں ہیں جس کو پڑھ کر کیف و سرور سے ہمکنار ہوں ملاحظہ ہوں۔

آئینہ ہے یہ جہاں اس میں جمال اپنا ہے صورت غیر کہاں ہے یہ خیال اپنا ہے

دیکھا تو ہر اک جا ہے حرم دیر کہاں ہے اللہ ہی اللہ ہے یہاں غیر کہاں ہے

اپنے ہی گھر میں خدائی جو کوئی سمجھے حضور ہاں مگر قید خودی سے ٹک رہائی چاہئے

---

[1] تذکرہ شورش صفحہ ۲۱۰۔

حضرت میر سید علی غمگین دہلوی رح

صوفی شعرا میں سے جنہوں نے اردو شاعری میں تصوف کو اپنا موضوع بنایا ہے ان میں سے میر سید علی غمگین ایک ہیں۔ ایک زمانے تک آپ پردۂ گمنامی میں رہے حالانکہ غالب دہلوی جیسے شاعر نے آپ کے نام کئی خطوط لکھے ہیں اور وحدت الوجود کے مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا ہے۔ اس اعتبار سے آپ کی حیثیت اردو کی صوفیانہ شاعری میں مسلم ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت دہلی ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۳ء میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام میر سید محمد تھا جن کا شمار دہلی کے صاحبِ دولت اور ثروت میں ہوتا تھا۔ غمگین دہلوی کی ابتدائی زندگی اور عالمِ شباب کا زمانہ بھی عیش و عشرت اور رنگارنگی میں گزرا۔ مگر ۲۹ سال کی عمر میں آپ پر جذب کی کیفیت طاری ہوگئی اور درویشی اختیار کرلی۔ آپ کی دنیا ہی بدل گئی اور بعد میں تقدس کا یہ عالم رہا کہ آپ حضرت جی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آخر میں گوالیار جاکر اقامت پذیر ہوئے اور وہیں ساری عمر درویشانہ زندگی بسر کی۔

غمگین صوفی شاعر تھے اور آپ نے اپنے اشعار میں تصوف کے مختلف مسائل کو پیش کیا ہے۔ عملی طور پر بھی آپ صوفی صافی تھے اس لئے آپ کے مشاہدات اور واردات قلبی شعر کے سانچے میں ڈھلتے رہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے ان کے متعلق اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ :-

> "غمگین اپنے عہد کے ایک اچھے شاعر تھے آپ کی شاعری میں تصوف کے مختلف رموز و نکات موجود ہیں۔ آپ کی شاعری کی قدر مرزا غالب بھی کرتے تھے[1]"

---

[1] تصوف اور اصغر گونڈوی مصنفہ ڈاکٹر سلام سندیلوی صفحہ ۳۵۲ ناشر نسیم بکڈپو دسمبر ۱۹۷۶ء۔

غمگین نے رباعیات بھی کہی ہیں اور اس میں تصوف کے نکات بڑے دلکش انداز میں واضح کئے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

در وحدت وجود

جو یہ کہتے ہیں لوگ سب یہ کثرت کثرت — آتی ہے سخن پہ ان کے مجھ کو حیرت
غمگین نہیں قال و حال پر موقوف — کثرت کو وجود ہی نہیں جز وحدت

در تعریف فقر

گر فقر سے ہووے آشنائی تجھ کو — تو عین کدر میں ہو صفائی تجھ کو
درویشی میں ہو تونگری اے غمگین — اور بندگی میں ہو بس خدائی تجھ کو

در معنی تصوف و حقیقت فقر

غمگین کوئی پوچھے گر تصوف کیا ہے — کہہ بے خودی اپنی میں شہود اس کا ہے
جو پوچھے فقیر کس کو کہتے ہیں تو کہہ — مفلس آپ سے اپنے جو ہوتا ہے

غمگین کی غزلوں میں بھی تصوف کے نکات ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ جو اے دل زوال ہے تیرا — جان اس کو کمال ہے تیرا
دین و دنیا و ماوراء اس کے — کچھ نہیں اک خیال ہے تیرا
جب تلک ہے توہم ہجراں — تجھ سے ملنا محال ہے تیرا
ہے مرا حال اب وہ اے غمگین — یہ جو کچھ قیل و قال ہے تیرا

حضرت غمگین محبت رسول میں بھی سرشار اور عشق حقیقی کے بھی طلبگار ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔[1]

ظاہر و باطن ہے حمد و نعت ہر انسان کا — معنی و صورت یہ مطلع ہے مرے دیوان کا

---

[1] مسائل تصوف مصنفہ میکش اکبر آبادی ص ۱۶۹

ہے مراظاہر محمدؐ اور باطن ہے خدا — قال یہ ہے حال کھونا اپنے ہے ایمان کا

روبرو ہے پر اسے دیکھا نہیں جاتا ہے آہ — کیا کہوں میں حال اپنے حسرت و ارمان کا

بے سر و سامانی اک سامان ہے اے دل یاد رکھ — کاروان عشق میں ہر بے سر و سامان کا

معرفت پر اس کی حق کی معرفت موقوف ہے — مرتبہ ایسا ہے عالی حضرت انسان کا[۱]

---

۱ مسائل تصوف صفحہ ۱۶۹ مصنف میکش اکبرآبادی۔

بے نظیر شاہ وارثی

بے نظیر شاہ وارثی کا اصل نام سید صدیق احمد اور ان کے والد کا نام سید احسان علی شاہ دریزی تھا آپ کی ولادت باسعادت کڑا مانک پور ضلع الٰہ آباد میں سنہ ۱۲۸۰ھ مطابق سنہ ۱۸۶۳ء میں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے وطنِ اصلی کڑا مانک پور میں ہوئی۔ عربی فارسی کے فاضل تھے۔ انگریزی کی بھی واقفیت تھی، علمِ طب بھی حاصل کیا تھا۔

آپ فطری شاعر تھے۔ وحید الٰہ آبادی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ قصیدہ اور مثنوی میں اکثر منشی امیر احمد مینائی سے اصلاح لی ہے۔ حضرت حاجی وارث علی شاہ قدس سرہٗ کے مرید وخلیفہ تھے۔ اکثر جذب اور کیف کی حالت میں رہتے تھے۔ آپ کو اپنے پیرو مرشد سے والہانہ عشق تھا۔ گویا فنا فی الشیخ تھے۔ آپ کا یہ مشہور شعر ہے ؎

یہ مانا کوئی حد ہوس کی نہیں محبت مگر اپنے بس کی نہیں

آخر عمر میں آپ حیدرآباد تشریف لے گئے اور تا مدتِ حیات وہیں قیام پذیر رہے۔ ۳۰ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ مطابق ۲ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء کو حیدرآباد میں انتقال فرمایا اور حیدرآباد ہی کی زمین آپ کی آخری آرام گاہ بنی۔

بے نظیر صوفی شاعر تھے۔ آپ کے اشعار میں تصوف کی رنگا رنگی اور حقیقت و معرفت کی جلوہ گری نمایاں ہے۔ اسی لئے آپ کا شمار صوفی شعرا میں ہوتا ہے۔ غزلوں پر آپ نے زیادہ طبع آزمائی کی ہے جس میں تصوف کا رنگ و آہنگ بھی ہے اور والہانہ انداز بھی۔ مثال کے طور پر یہ غزل ملاحظہ فرمایئے ؎

نہ رہا حجابِ نیاز بھی جو نگاہ اہلِ نیاز میں
تو رہا نہ تیرے سوا کوئی کہیں پردۂ حسنِ مجاز میں

وہی عین ہے جو خیال ہے یہ مری حقیقتِ حال ہے
کہ شراب ہوں درِ مے کشی تو نماز ہوں میں نماز میں

نہ ہوا اپنی آنکھ جو حسن بیں تو جہاں میں کوئی حسیں نہیں
جو وہ غزنوی کی نگاہ ہو وہی خم ہیں زلفِ ایاز میں

یہ جہاں نہیں یہ ہے آئینہ، ہے تصور ہمہ واہمہ
وہی جلوہ آئینہ ساز کا ہے نگاہ آئینہ ساز میں

مرے جرم کیا ہیں گناہ کیا تری شانِ لطف پہ ہیں فدا
کہ جلال میں بھی کمی نہیں ترے عفو بندہ نواز میں

تو چراغ دیر و حرم رہے تجھے کیا پڑی ہے جو تو نے
کہ تمام رات بسر ہوئی ہے کسی کی سوز و گداز میں

دل زار سینہ میں کیوں ڈرے مجھے دشمن کوئی کہیں کرے
مری خاک بھی مری روح بھی ترے در پہ ہو گی حجاز میں

جو بنا یہاں وہی مٹ گیا جو مٹا یہاں وہی بن گیا
یہی بے نظیر روایت ہے رہ عشق شیدہ یار میں

بے نظیر شاہ کے اشعار میں والہانہ پن ہے۔ وہ عشقِ حقیقی کو بھی مجاز کے رنگ میں پیش کرتے ہیں ان کے یہاں عشق کا تصور سب سے زیادہ اہم ہے اور یہ تصور فنا فی الشیخ اور تصورِ شیخ ہے۔ آپ کے شیخِ طریقت نے بھی آپ کے اشعار میں وہ سوز و گداز پیدا کیا کہ بے نظیر شاہ کے اشعار عشق کی وارفتگی اور سرد و سرمستی کی یہ ایک ایسی مثال ہے جو دوسرے شعراء کے یہاں خال خال نظر آتی ہے۔ اسی حقیقت کی روشنی میں بے نظیر شاہ کی مشہور غزل پیش کر رہا ہوں، ملاحظہ ہو ے

نہ رہے اکیلے جنوں میں بھی یہ تلاش ہمسفری رہی
خرد و حواس جو چل بسے تو جلو میں بے خبری رہی

ہوئے خشک پھول چمن نیا کہیں نام کو نہ تری رہی
یہی اپنے زخم ہرے رہے یہی آنکھ اپنی بھری رہی

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑے
یہ میری جبین نیاز تھی کہ جہاں دھری کی دھری رہی

بڑی احتیاط طلب ہے یہ جو شراب ساغر دل میں ہے
جو چھلک گئی تو چھلک گئی جو بھری رہی تو بھری رہی

وہ ملال تھا کہ نکل گیا وہ خیال تھا کہ بدل گیا
مرے شکوے ایسے کبھی نہ تھے جو طبیعت انکی بھری رہی

رہا باخبر تو نہ یہ کھلا کہ مآل و غایت عشق ہے کیا
ہوئے بے خبر تو خبر ہوئی کہ خبر سے بے خبری رہی

تری چشم مست کی آگ تھی مری روح نزع میں تشنہ تھی
کہ شراب گو نہ میں پی سکا مرے سامنے تو دھری رہی

تری خاکِ در مجھے مل گئی تو ہوس نہ دل میں رہی کوئی
نہ وہ کیمیا کی طلب رہی نہ طلب کی دربدری رہی

وہ ہزار در پے کیں رہا وہ ہزار پردہ نشیں رہا
وہی بے نظیر حزیں رہا وہی اسکی جلوہ گری رہی

بیدم شاہ وارثی

اردو کی دنیائے شاعری میں اور بالخصوص نعتیہ کلام اور حقائق و معارف کی چاشنی میں بیدم شاہ وارثی خاص شہرت کے حامل ہیں۔ آپ کا نام سراج الدین اور بیدم تخلص ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں اٹاوہ میں ہوئی۔ علوم رسمیہ کی ابتدائی اور آخری تعلیم اٹاوہ ہی میں حاصل کی۔ ایک زمانے تک گیا کے محلہ آبگلہ میں قیام پذیر رہے۔

فطری شاعر تھے اس لئے ذوق و وجدان کی ہم آہنگی ان کے یہاں نظر آتی ہے۔ ابتدا میں دوسروں کی غزل سنتے تھے اور اسے یاد کر کے خود گنگناتے رہتے۔ آخر کار شاعر بننے کی تمنا دل میں موجزن ہوئی۔ نثار اکبرآبادی جو کہ وحید الہ آبادی کے شاگرد تھے ان کے حلقہ تلمذ میں آئے اور اپنے کلام پر اصلاح لیتے رہے۔ خوش بختی سے حضرت حاجی وارث علی شاہ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔ چونکہ سلسلہ وارثیہ میں پہلی تعلیم عشق کی ہوتی ہے اس لئے آپ میں عشق مجازی سے عشق حقیقی کا جذبہ پیدا ہوا اور آپ کی صوفیانہ شاعری کی یہی ابتدا تھی۔ پہلے آپ کا تخلص بیدم تھا۔ بیعت ہونے کے بعد آپ بیدم شاہ ہو گئے۔ بیدم شاہ وارثی کو اپنے پیر سے غایت درجہ کی عقیدت تھی بلکہ عشق تھا۔ ۱۹۰۵ء میں آپ کے پیر و مرشد حضرت حاجی وارث علی شاہ کا انتقال ہو گیا تو آپ کی شاعری نے ایک نیا موڑ لیا۔ دل پر کیف و سرور کی ایسی کیفیت چھائی کہ آپ کے اشعار میں بھی وہی والہانہ پن اور کیف و سرور پیدا ہو گیا۔ آپ جب کوئی غزل کہتے تھے تو سب سے پہلے آستانہ وارثی دیوہ شریف میں سنا آتے تھے اس کے بعد ہی دوسروں کو سناتے۔ آپ کے کلام کے کئی مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں حسین گنج لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ وصیت کے مطابق آپ کی لاش دیوہ شریف لے جائی گئی اور وہیں شاہ اویس کے قبرستان میں

دفن ہوئے۔

حضرت بیدم شاہ وارثی کے کلام میں نہ صرف حقائق و معارف ہیں بلکہ جو والہانہ انداز اور عشق حقیقی کی آنچ ہے وہ ان کی شاعری کا ایک اہم عنصر ہے۔ ان کی مشہور غزل ہے۔

بت خانے میں کعبے کی تنویر نظر آئی — بت میں بھی ہمیں تیری تصویر نظر آئی

وابستۂ گیسو کو گیسو کا خیال آیا — جب دور سے زنداں کی زنجیر نظر آئی

یہ گلشنِ ہستی بھی اک دفترِ رنگیں ہے — ہر گل کے ورق پر اک تصویر نظر آئی

جب ان کی نظر بدلی شام اور سحر بدلی — بیزار دعاؤں سے تاثیر نظر آئی

بیدم شبِ فرقت میں مرنے کی دعا مانگی — جب یار کے آنے میں تاخیر نظر آئی

عشق میں بندۂ خدا کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتا ہے اس حقیقت کو بیدم کے ان اشعار میں دیکھئے۔

جنونِ عشق کی نیرنگیاں ارے تو بہ — کبھی خدا ہوں کبھی بندۂ خدا ہوں میں

بقا کی فکر نہ اندیشۂ فنا مجھ کو — تعینات کی حد سے گزر گیا ہوں میں

بیدم کی یہ غزل بھی ملاحظہ کیجئے جس میں کتنا سرور اور کیف و سوز ہے۔

کاش مری جبینِ شوق سجدوں سے سرفراز ہو — یار کی خاک آستاں تاجِ سرِ نیاز ہو

ہم کو بھی پائمال کر عمر تری دراز ہو — مستِ خرام ناز ادھر مشقِ خرام ناز ہو

سامنے روئے یار ہو سجدہ میں ہو سرِ نیاز — یونہی حریم ناز میں آٹھوں پہر نماز ہو

اس کے حریم ناز میں عقل و خرد کو دخل کیا — جس کی گلی کی خاک کا ذرہ جہانِ راز ہو

تری گلی میں پا کے جا جائے کہاں ترا گدا — کیوں نہ وہ بے نیاز ہو تجھ سے جسے نیاز ہو

بیدم خستہ ہجر میں بن گئی جانِ زار پر
جس نے دیا ہے دردِ دل کاش وہ چارہ ساز ہو

بیدم شاہ وارثی کی غزلوں میں حقائق و معارف کا جو والہانہ انداز، عشق کی بیباکی اور کیف و سرور کی کار فرمائی ہے وہ انہی کا خاص حصہ ہے۔ اس غزل میں ان ہی حقائق کی چاشنی ملے گی۔ ملاحظہ ہو۔

اب آدمی کچھ اور ہماری نظر میں ہے — جب سے سنا ہے یار لباسِ بشر میں ہے

اپنا ہی جلوہ ہے جو ہماری نظر میں ہے — اب غیر کون چشمِ حقیقت نگر میں ہے

وہ گنجِ حسن ہے دلِ ویراں میں جلوہ گر — فضلِ خدا سے دولتِ کونین گھر میں ہے

بس اک فروغِ نقشِ کفِ پا کے فیض سے — ہر ذرہ آفتاب تیری رہ گذر میں ہے

حیران ہوں کہ سجدہ کروں تو کدھر کروں — کعبہ میں بھی وہی بتِ کافر نظر میں ہے

بیدم یہ جستجو بھی عجب ہے عجب تلاش
نکلے ہیں ڈھونڈنے کو اسے ہم جو گھر میں ہے

صوفی شاعری کی حیثیت سے اگر نہیں تو شاعرِ تصوف کی حیثیت سے میر تقی میر کا بھی اردو شاعری میں ایک مقام ہے۔ میر تقی میر کے والد محمد علی صوفی منش اور درویش صفت تھے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ حجاز سے ہندستان آئے اور جدِ اعلیٰ نے اکبر آباد میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ میر کی پیدائش ۱۱۳۵ھ مطابق ۱۷۲۳ء میں اکبر آباد میں ہوئی۔ میر کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر ہی پر ہوئی۔ زیادہ تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ اس دور میں دو شخصیتوں کا اثر ان کی زندگی پر گہرا پڑا۔ ایک احسان اللہ درویش اور دوسرے ان کے والد کے مرید میر امان اللہ تھے۔ میر امان اللہ درویش صفت تھے اور میر نے امان اللہ سے گہرا اثر قبول کیا۔ گیارہ برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ کچھ دنوں اطرافِ شہر میں نوکری کرتے رہے جب اس طرح گزر کی صورت نہ دیکھی تو دہلی روانہ ہو گئے۔ میر تقی میر کے والد نے دوسری شادی کی تھی جس سے میر تقی میر تھے۔ میر تقی میر کی سوتیلی ماں خان آرزو کی بہن تھیں۔ میر غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں ہی سے اتنے پریشان ہوئے کہ جنون نے انہیں ہمکنار کیا لیکن دو سال کے بعد ہی انہیں صحتیابی ہوئی اور میر جعفر عظیم آبادی سے درس لینا شروع کیا اور سعادت امروہوی کی ترغیب سے ریختہ گوئی شروع کی اور میر تخلص اختیار کیا۔ دیوانگی کے دو سال بعد ہی وہ دنیائے ادب میں مشہور ہو چکے تھے۔ ۱۱۹۶ھ میں میر لکھنؤ پہنچے اور آصف الدولہ کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوئے۔ لکھنؤ میں میر کا قیام گو مالی اعتبار سے آسودگی بخش معلوم ہوتا ہے مگر وہ لکھنؤ کی ادبی فضا سے مطمئن نہ رہ سکے۔ آخر کار نوّے سال کی عمر میں ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ کے محلہ ستہٹیا میں ان کا انتقال ہو گیا اور وہیں اکھاڑہ بھیم کے

قبرستان میں دفن ہوئے ۔ ؎۱

میر تقی میر غزل گوئی کے اعتبار سے وہ خدائے سخن کے لقب سے یاد کیئے جاتے ہیں ۔ وہ شاعرِ تصوف تھے ۔ ان کی غزلوں میں صوفیانہ خیالات کا در آنا ان کے ماحول، تربیت اور خاندانی ورثہ کی وجہ سے تھا تو دوسری طرف اس عہد کا انتشار اور بدامنی تھی جس سے تصوف کی طرف ان کا میلان ہوا ۔ سب سے زیادہ میر امان اللہ جیسے درویش صفت کی صحبت نے ان کو تصوف کی رغبت دلائی وہ خود بھی میر کو بزرگوں کی خدمت میں لے جاتے تھے ۔ پھر گھریلو مناقشات اور والد کے سایۂ رحمت سے محروم ہو جانا بھی میر کو تصوف کی طرف مائل کرنے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ اصل میں میر عشقِ مجازی کے قائل تھے لیکن مجاز کے بعد ہی حقیقت کی منزل آتی ہے اس لئے عشق حقیقی کے لیے عشق مجازی کا ہونا ضروری ہے میر تقی میر نے بھی اس کے متعلق اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ؎

ارض و سما میں عشق ہے طاری چاروں اور بھرا ہے عشق
ہم ہیں جنابِ عشق کے بندے نزدیک اپنے خدا ہے عشق

صوفیا نے ہمہ اوست اور ہمہ از وست کے فلسفہ کو نہایت تزک و احتشام سے پیش کیا ہے ۔ میر تقی میر بھی اس خیال کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

جزو مرتبہ کل کو حاصل کرے ہے آخر اک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

انسان کائنات کا جائزہ لیتا ہے اور اپنے مشاہدات سے معرفتِ الٰہی حاصل کرتا ہے لیکن پھر بھی دل میں تشکک کا ایسا جذبہ رکھتا ہے کہ وہ ذاتِ باری کا عرفان حاصل نہیں کر پاتا ؎

؎۱ حدیثِ میر مرتبہ مقبول احمدلاری ۔ میر تقی میر سفرِ حیات از ڈاکٹر محمد حسن ص ۱۵-۲

یہی جانا کہ کچھ نہیں جانا — سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم
گرچہ تو ہی ہے سب جگہ لیکن — ہم کو تیری نہیں ہے جا معلوم

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ — ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

کب سے نظر لگی تھی دروازۂ حرم سے — پردہ اٹھا تو لڑیاں آنکھیں ہماری ہم سے

مظاہرِ خداوندی ہر جگہ ہے اور وہ خود بھی ہر جگہ ہے لیکن اپنی کج فہمی کی وجہ سے کسی مخصوص جگہ ہم اسے مقید کر دیتے ہیں خواہ وہ دیر ہو یا حرم جس کے سبب اس تک رسائی نہیں ہوتی۔ ؎

گہہ دیر میں ہیں گہے حرم میں — اپنا تو یہی دِوانہ پن ہے

یکجا اٹک کے رہنا ہے ناتمامی ورنہ — سب میں وہی حقیقت یاں ساری ہو گئی

اللہ تعالیٰ کی حقیقت ایک ہی ہے لیکن مختلف اور متضاد خیالات نے اختلاف کی صورت پیدا کی جو بے معنی ہیں۔ میر دلکش پیرائے میں کہتے ہیں ؎

کس کو کہتے ہیں نہیں میں جانتا اسلام و کفر — دیر ہو یا کعبہ مطلب مجھکو تیرے در سے ہے

یارانِ دیر و کعبہ دونوں بلا رہے ہیں — اب دیکھیں میر اپنا جانا کدھر بنے ہے

میر تقی میر کی غزلوں میں بھی سوز و گداز کے ساتھ ساتھ تصوف کے رموز و اسرار ہیں۔ اس غزل کا مطالعہ کیجئے ؎

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا — خورشید میں بھی اس ہی کا ذرّہ ظہور تھا
ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا — پیدا ہر اک نالے سے شورِ نشور تھا
پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں — معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم — یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر | کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا
منعم کے پاس قاقم و سنجاب تھا تو کیا | اس رند کی بھی رات گزر گئی جو عور تھا
ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر | اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا
کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا | یکسر وہ استخواں شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر | میں بھی کبھی کسو کا سرِ پُر غرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

سحر گہ عید میں دورِ سبو تھا | پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا
غلط تھا آپ سے غافل گزرنا | نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا
چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ | کہ ہر غنچہ دلِ پُر آرزو تھا
گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا | جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا
مگر دیوانہ تھا گل بھی کسو کا | کہ پیراہن میں سو جا گہ رفو تھا
جہاں پر ہے فسانے سے ہمارے | دماغِ عشق ہم کو بھی کبھو تھا

نہ دیکھا میر آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بہ کو تھا

خواجہ حیدر علی آتش

اردو کی دنیائے شاعری میں خواجہ حیدر علی آتش کی عظمت مسلم ہے ان کی شاعری میں دبستان دہلی کی داخلیت بھی ہے اور دبستانِ لکھنؤ کی خارجیت بھی۔ آتش کا وطنِ اصلی دہلی تھا مگر جب دہلی میں انقلاب آیا اور شرفاء کی عزت و آبرو خاک میں ملنے لگی تو اہلِ علم و فضل اپنی عزت و آبرو کی تحفظ کے لئے ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اس کے ماسوا توکل و قناعت کے نام لیواؤں کے بھی قدم ڈگمگانے لگے۔ خواجہ حیدر علی آتش کے والد علی بخش بھی دہلی کو خیرباد کہہ کے نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد میں سکونت پذیر ہوئے۔ فیض آباد آتش کی جائے پیدائش ہے۔ تحصیلِ علوم میں قدم رکھا ہی تھا اور عربی و فارسی کی ابتدائی درسیات کی تکمیل ہی ہوتی تھی کہ اپنے والد کے سایۂ شفقت سے محروم ہو گئے اور انہیں تکمیلِ علوم کا موقع نصیب نہ ہو سکا۔ مجبور ہو کر تلاشِ روزگار میں فیض آباد سے لکھنؤ آئے اور نواب اودھ کی نظرِ عنایت سے زندگی گذارنے کے لئے کچھ ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ غلام ہمدانی مصحفی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور مشورۂ سخن لیتے رہے۔ چند ہی دنوں میں بعض وجوہ کی بنا پر دونوں میں ان بن ہو گئی اور یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ آتش کا انتقال ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں ہوا۔

آتش کا خاندان چونکہ دہلی کا تھا اس لئے صوفیانہ مزاج کی ہم آہنگی تھی اور چونکہ اس دور میں غم و اندوہ کے بادل چھائے رہتے تھے اس لئے ہر شخص حزن و یاس کا پیکر تھا اس لئے صوفیانہ رجحان عام ہو گیا۔ کچھ لوگ دادِ عیش میں پناہ لینے لگے تو کچھ لوگ تصوف اور عرفانِ الٰہی کا سہارا لینے پر مجبور ہوئے۔ آتش پر بھی فقیری کا رنگ غالب آگیا۔ یہی سبب ہے کہ آپ نے تصوف کے مسائل کو بہت ہی خوش اسلوبی سے اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ ان کے کلام کے ایک دو

شعر نہیں بلکہ پوری غزل مسائلِ تصوف سے لبریز ہے۔ خواجہ آتش عملی طور پر صوفی تو نہ تھے لیکن صوفیانہ خیالات کو علمی اور فنی طور پر اپنے کلام میں پیش کیا ہے اس لئے ان کو شاعرِ تصوف کہا جائے تو بجا ہے۔ ان کی مشہور غزل جس میں تصوف کی کیفیتیں اس طرح موجزن ہیں جیسے ان کے وارداتِ قلبی کی ترجمان ہوں۔ یہ غزل ملاحظہ ہو۔ ؎

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

اسیرانِ دو رشتہ ہے عاشق و معشوق دونوں میں
گرفتارِ آہنی زنجیر کا یہ وہ طلائی کا

تعلق روح سے مجھ کو جسد کا ناگوار ہے
زمانے میں چلن ہے چار دن کی آشنائی کا

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو
کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا

وصالِ یار کا وعدہ ہے فردائے قیامت پر
یقیں مجھ کو نہیں ہے گور تک اپنی رسائی کا

دل اپنا آئینہ ہے صاف عشقِ پاک کہتا ہے
تماشا دیکھتا ہے حسن اس میں خود نمائی کا

نہیں دیکھا ہے لیکن مجھ کو پہچانا ہے آتش نے
بجا ہے اے صنم جو تجھ کو دعویٰ ہے خدائی کا

میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ آتش اردو کے صوفی شاعر نہیں ہیں لیکن شاعرِ تصوف ضرور ہیں۔ اس لئے کہ ان کے کلام میں صوفیانہ مسائل کی بجائے عشقِ حقیقی کی رنگا رنگی، سوز و گداز کی اثر انگیزی اور کیف و سرور کی ہمہ گیری بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ آتش کی یہ غزل اس حقیقت کی ترجمان ہے۔ ملاحظہ ہو۔

تازہ ہو دماغ اپنا تمنا ہے تو یہ ہے
اس زلف کی بو سونگھئے سودا ہے تو یہ ہے

محشر کو بھی دیدار کا پردہ نہ کرے یار
عاشق کو جو اندیشۂ فردا ہے تو یہ ہے

کہہ یادِ صنم دل میں ہے گہہ یادِ الٰہی
کعبہ ہے تو یہ ہے جو کلیسا ہے تو یہ ہے

دل کے لئے ہے عشق تو دل عشق کی خاطر
مے ہے تو یہ ہے اور جو مینا ہے تو یہ ہے

بینا ہوں جو آنکھیں تو رخِ یار کو دیکھیں
نظارے کے قابل جو تماشا ہے تو یہ ہے

ثابت دہنِ یار دلیلوں سے کر آتش
حجت کی جو شاعر کے لئے جا ہے تو یہ ہے

ؔ مسائلِ تصوف ص ۱۴۳ مصنفہ بیکش اکبر آبادی۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی

غالب اردو دنیا میں ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے روشناس ہیں بلکہ اپنی شاعرانہ عظمت کا سکہ بٹھاتے ہوئے ہیں لیکن شاعر تصوف کی حیثیت سے دنیائے اردو ان سے بہت کم واقف ہے۔ یہ اس لئے بھی کہ نہ وہ لبوریہ نشین ہیں نہ خانقاہی آداب سے واقف اور نہ صوفی شاعر ہونے کا دعوٰی۔ اگرچہ اس کی شاعری میں تصوف کے اسرار و رموز جس انداز اور کیف و کم سے پائے جاتے ہیں وہ صوفی شاعر کے یہاں بھی اس جاذبیت کے ساتھ نظر نہیں آتے اور وہ خود بھی کہتے ہیں۔ ؎

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب　　تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مرزا غالب کے تعارف کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ کا نام نامی اسد اللہ خاں اور تخلص غالب ہے۔ مرزا نوشہ کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ کی ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ میں آگرہ میں ہوئی۔ باپ کے سایۂ عاطفت سے پانچ ہی برس کی عمر میں محروم ہوگئے۔ چچا نے اس درِ یتیم کی سرپرستی قبول کی اور کچھ دنوں کے بعد وہ بھی نہ رہے۔ آخر نانا نے اس درِ یتیم کو اپنے زیرِ سایہ لیا۔ ابتدائی تعلیم کا سلسلہ آگرہ ہی میں رہا اور شیخ معظم کی شاگردی اختیار کی۔ شعر گوئی سے فطری مناسبت تھی۔ گیارہ برس کی عمر ہی سے شعر کہنے لگے۔ ۱۸۱۶ء میں حسام الدین حیدر نے میر کے سامنے ان کے اشعار پیش کئے تو اشعار دیکھ کر انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر اس کو کوئی اچھا استاد مل گیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔ آخر ان کو استاد کامل ملا عبدالصمد ایرانی کے روپ میں مل گیا جس نے زبان و ادب کے نکات سے واقفیت بہم پہنچائی۔ اگرچہ محققین ادب اردو ملا صمد کو فرضی استاد تسلیم کرتے ہیں۔

غالب کی زندگی کے آخری ایام بڑے پُر درد گزرے ہیں۔ لیکن شاعر کی حیثیت سے آپ نے اردو دنیا میں ایک انقلاب لایا جس پر نہ جانے کتنی تصانیف تالیف ہو چکی ہیں۔ میرا مدعا یہاں پر صرف

غالب کو بحیثیتِ شاعر متعارف کراتا ہے ورنہ غالب کی عظمت کی دلیل حضرت تصوف میرزا کی اس رباعی سے بھی مترشح ہے ؎

سب تیغ زباں سے انہیں پہچانتے ہیں　　غالب وہ ہیں سب اہل سخن جانتے ہیں
یہ شیرِ خدا کے نام کی ہے برکت　　لوہا اسد اللہ کا سب مانتے ہیں

اردو شاعری میں اور بالخصوص غزل گوئی میں جو تصوف کو ہمہ گیری ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور یہی وجہ ہے کہ تمام عظیم شاعروں نے اس میں کچھ نہ کچھ اشعار ضرور کہے ہیں لیکن غالب نے جس فنکارانہ طور پر صوفیانہ خیالات کو اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے وہ صوفی شعراء کے کلام میں بھی خال خال نظر آتے ہیں۔ غالب صوفی شاعر نہیں ہیں۔ میں نے قبل ہی عرض کیا ہے کہ وہ عملی طور پر اس کوچہ سے نابلد ہیں۔ لیکن علمی اور فنی طور پر اس کوچہ سے صرف آشنا ہی نہیں بلکہ اس کوچہ گردی میں طاق نظر آتا ہے۔ آپ نے تصوف کے مختلف مسائل کو جس وقتِ نظری اور دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ اس کے کمال واقفیت کی دلیل ہے۔ غالب وجودی ہیں۔ وہ وحدت الوجود کے مسلک کے قائل ہیں بلکہ محی الدین ابن عربی کا بہت بڑا عقیدتمند۔ آپ نے اس مسلک میں جو شاعرانہ انداز پیش کیا ہے اس نے ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اور اس کو کتنے دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں ؎

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

خدا کی تجلی بھی ہر جگہ ہے۔ وہ ہر آن ایک نئی شان سے جلوہ گر ہے۔ یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز　　پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اور ہمہ اوست کے مسئلہ کو وہ اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن　　ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

اور کتنے دلکش پیرایہ میں آپ وجودیت کو اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آتے ہیں　　ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

غالب گرچہ صوفی نہ تھے لیکن صوفی کا درد دھڑکتا ہوا دل ضرور رکھتے تھے۔ وہ کائناتِ عالم کا مطالعہ کرتے۔ جمالِ خداوندی کی جلوہ سامانی نظر آتی جس میں پوری کائنات ڈوبی ہوئی ہے۔ وہ ان کو الف سے متاثر ہو کر بے ساختہ کہہ اُٹھتے ہیں ؎

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے ۔۔۔ حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اور ذرا اس شعر پر بھی نظر ڈالئے ؎

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ۔۔۔ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالب کے یہاں عشقِ حقیقی کی بھی جلوہ آرائی ہے، تسلیم و رضا کی بھی سرمستی ہے۔ لیکن سب میں اس کا مخصوص رنگ و آہنگ ہے جو اس کی وارداتِ قلبی محسوس کرتی ہے۔ غالب کو دیکھ کر تو ہم صوفی نہیں کہہ سکتے لیکن آپ کے کلام کے کیف و سرور میں جب ایک صوفی ڈوب جاتا ہے تو انہیں شاعر تصوف کہنے کو جی نہیں چاہتا بلکہ بے ساختہ زبان سے یہی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ غالب صوفی شاعر ہیں اور فقط صوفی شاعر ہیں۔ اب میں ان کی ایک صوفیانہ غزل پیش کرتا ہوں جس میں صوفیانہ حقائق کا کیف و کم بھی نظر آتا ہے اور رنگ و آہنگ بھی ؎

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں ۔۔۔ یہ سوئے ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند ۔۔۔ گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع ۔۔۔ گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے ۔۔۔ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے ۔۔۔ جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں ۔۔۔ حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر ۔۔۔ یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی ۔۔۔ ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز ۔۔۔ پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ۔۔۔ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست ۔۔۔ مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

علامہ اقبال

علامہ اقبال کو دنیا فلسفی، شاعرِ حکمت، شاعرِ امت، وطنی شاعر، پیامبر، راہبر و رہنما اور نہ جانے کن کن حیثیتوں سے جانتی ہے لیکن صوفی شاعر یا شاعرِ تصوف کی حیثیت سے اردو دنیا واقف نہیں بلکہ ان کے کلام کے تجزیہ سے ناقدین نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اقبال تصوف کا مخالف ہے۔ اس لئے وہ خود کہتا ہے کہ ؎

یہ سالک مقامات میں کھو گیا عجم کے خیالات میں کھو گیا

لیکن یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ درد مند دل لے کر آیا تھا اس کا ماحول عارفانہ تھا اور خود وہ اپنے فرزند جاوید کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو ہے اس کا مذاق عارفانہ

اقبال کی پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء مطابق ۴ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ میں سیالکوٹ میں ہوئی۔ آپ کا خاندان کشمیری برہمن تھا جو تقریباً دو سو سال قبل مشرف بہ اسلام ہوا اور پھر اس خاندان میں مذہب کی ایسی شدت آئی کہ سرتاپا ان کا ہر فعل و عمل مذہب کے رنگ میں رنگ گیا۔ اقبال کی تعلیم و تربیت بھی اسی ماحول میں ہوئی جیسا کہ تذکروں میں مشہور ہے۔ ایک مشاعرہ میں اقبال کے اس شعر نے کیف و سرور کی دنیا کیسی بدل دی ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

اقبال کا مطالعہ بہت عمیق تھا اور سفرِ یورپ نے بھی ان کے تجربات میں وسعت پیدا کی۔ انہوں نے فلسفہ نیز فلسفۂ اسلامی، تاریخِ عامہ اور تاریخِ اسلامی، حدیث اور تفسیر کے ساتھ ساتھ علمِ تصوف کا بھی گہرا مطالعہ کیا اور اس کو مختلف اندازِ فکر سے سوچتے اور سمجھتے رہے۔ مسلمانوں کی رہبری

اور رہنمائی بھی کی اور آخر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو یہ آفاقی شاعر اپنے معبود حقیقی سے جا ملا۔

اقبال کا گھرانہ تصوف کا پرداداور عرفان الہی کا دیوانہ کہا جاتا ہے۔ یقیناً ایسے ہی ماحول میں اقبال نے آنکھیں کھولیں اور اسی کے زیر سایہ تربیت بھی ہوئی اور پروان بھی چڑھے۔ البتہ وسعت مطالعہ اور تجربات نے نام نہاد تصوف سے دل برداشتہ کر دیا لیکن جب انہوں نے عبدالکریم جیلی اور مولانا رومی، فریدالدین عطار، عمر خیام اور حافظ شیرازی کے کلام کا مطالعہ کیا تو وہ کہہ اٹھے کہ ؎

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی — مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

اقبال کا نظریہ تصوف اصطلاحی طور پر نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس قائل ہے کہ ؎

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی — ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

اقبال نے جب کائنات کا مشاہدہ کیا تو ہر جگہ انھیں معشوق ازلی ہی کے پاؤں کے نشاں ملے اور اس کی شوخی سے متاثر ہو کر وہ پکارتے ہیں ؎

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے — کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

اقبال نہ صرف وحدت الوجود ہی کے قائل ہیں بلکہ وہ وحدت الشہود میں بھی اسی کی جلوہ گری دیکھتے ہیں اقبال کو ہر شئے میں اسی کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا — ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہے

اقبال کو کائنات کے ہر ہر ذرہ میں اسی کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ انہوں نے ذیل کے اشعار میں دوئی کو کس دل آویزی کے ساتھ مٹایا ہے ؎

حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے — انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

اقبال کی مشہور غزل جسے مناجات کے نام سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے لیکن میرے خیال میں اقبال نے صوفیانہ لہجہ میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ انسان کسی حال میں بھی خدا سے دور نہیں ہو سکتا۔ البتہ ہر انسان کی کیفیت جداگانہ ہوتی ہے ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں — کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ — کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی　　مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

اقبال نے تصوف کو نئے انداز سے روشناس کیا ہے۔ خیالات میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ البتہ انداز بدلا ہوا ہے۔ اس لئے ان کی بہت سی غزلیں ایسی ہیں جس میں مزاج عاشقانہ ہے تو اس میں نوائے عارفانہ بھی ہے۔ اس غزل کو ملاحظہ کیجئے ؎

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں　　غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند　　میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں

پھر اقبال کی اس غزل کو بھی ملاحظہ کیجئے ؎

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر　　ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

اور کیا اس غزل میں تصوف کے نکات نہیں ہیں ؟

اپنی جولانگاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں　　آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم　　اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا　　مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام　　اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

فانیؔ بدایونی

اردو میں صوفیانہ شاعری کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا۔ ایک صوفی شاعر جو عملی طور پر اس پر گامزن رہے ہیں اور دوسرے شاعر تصوف جنہوں نے علمی اور فنی طور پر تصوف کے میدان میں اپنی جولانی طبع کا اظہار کیا ہے۔ فانیؔ بدایونی کا تعلق دوسری جماعت سے ہے۔ اسی لیے ان کا شمار شعرائے تصوف میں ہوتا ہے۔

آپ کا اصلی نام شوکت علی خاں اور فانیؔ تخلص ہے۔ آپ کی ولادت قصبہ اسلام نگر ضلع بدایوں میں ۱۸۷۹ء مطابق ۱۲۹۷ھ میں ہوئی۔ آپ کے خاندان کے ایک بزرگ نواب بشارت علی خاں مغلوں کے آخری دور میں بدایوں کے صوبہ دار تھے۔ فانیؔ کے والد کا نام شجاعت علی خاں تھا۔ وہ محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ فانیؔ کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی پھر انگریزی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا بریلی کالج سے بی۔ اے اور ۱۹۰۶ء میں علی گڈھ سے ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری لی۔ فانیؔ نے وکالت ضرور شروع کی لیکن کہیں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر وہ حیدرآباد دکن گئے اور وہیں ایک اسکول میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے اور اپنے آخری ایام تک وہیں رہے۔ ان کا آخری زمانہ بڑے درد و کرب میں گذرا۔ فانیؔ آخر ۱۹۴۱ء مطابق ۱۳۶۰ھ میں اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ خود ان کا ایک شعر ہے ؎

لو آج مرگ فانیؔ بیکس سے مٹ گئی وہ اک خلش جو خاطر اہل وطن میں تھی

فانیؔ فطری شاعر تھے اور وہ غزل کے شاعر تھے اور تصوف نے غزل میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔ اسی لیے کم و بیش اردو کے ہر شاعر نے ایک دو شعر تصوف کے تبرکاً ضرور کہے ہیں۔ فانیؔ صوفی شاعر نہیں تھے لیکن وہ شاعر تصوف ضرور تھے۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی فرماتے ہیں کہ :-

"تصوف کا عنصر ان کے یہاں واقعی اور اصلی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عملی تصوف سے ان کی زندگی ناآشنا رہی تاہم نظری تصوف ان کے یہاں محض رسما

بایرائے گفتن نہیں ہے" ۔ ؎۱

فانی کی شاعری میں صوفیانہ رمز و ایما بھی ہے۔ عشق حقیقی کی وہ دھیمی دھیمی آنچ ہے جس میں لذتِ سوز ہے۔ فانی صاف اور واضح انداز میں کہنے سے گریز کرتے ہیں بلکہ وہ رمز و ایما کے پردے میں بابت کچھ کہہ جاتے ہیں جس کے لئے دقتِ نظری درکار ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا ۔۔۔ ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا ۔۔۔ زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

اور اس شعر کی حقیقت کو سمجھئے ؎

کسی کے ایک اشارے میں کس کو کیا نہ ملا ۔۔۔ بشر کو زیست ملی موت کو بہانہ ملا

بے ذوقِ نظر بزمِ تماشا نہ رہے گی ۔۔۔ منہ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

غالب کا مشہور شعر ہے ؎

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ۔۔۔ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

فانی نے اس میں بھی کیا نکتہ پیدا کیا ہے۔ ان کا شعر بھی ملاحظہ کیجئے ؎

ہر جلوہ غیب شہود ہے پھر بھی غیب کے جلوے غیب میں ہیں
نظارہ نظر میں شامل ہے نظارے میں شامل کوئی نہیں

ماسوئی کی حقیقت کو فانی اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

کس کو کہتے ہیں ماسوئی جب تو نہیں تو کچھ نہیں
تو نظر آیا تو ایک عالم نظر آیا مجھے

فانی کی غزل درد و غم سے مستعار ہے۔ اور اس نے تدبیر اور تقدیر سے بھی ماورا کر دیا لیکن یہی تقدیر و تدبیر فانی کے یہاں تصوف کی سرحد کو چھو لیتی ہے اور ایک نئے تخیل کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ فانی کے اشعار دیکھئے ؎

؎۱ بحوالہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی "فانی کی شاعری" ص ۱۷۱ ۔

دیکھ فانیؔ وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو — اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے
سعیِ درماں بے اثر فکرِ دوا بے فائدہ — زخمِ دل اے چارہ گر قائل نہیں تدبیر کے

یاس کے آتے ہی ارماں دل سے یہ کہہ کر چلے — ہم نہیں ساتھی تری بگڑی ہوئی تقدیر کے

جبر و اختیار کے موضوع کو اردو کے تقریباً ہر شاعر نے پیش کیا ہے۔ فانیؔ کے یہاں دلکش پیرایہ میں یہ خیال آیا ہے ؎

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں — ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

محشر میں جبرِ دوست سے طالب ہوں داد کا — آیا ہوں اختیار کی تہمت لیے ہوئے

فانیؔ تیرے عمل ہمہ تن جبر ہی صحیح — سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

اور فانیؔ نے اس حقیقت کو دوسرے شعر میں اس طرح پیش کیا ہے ؎

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانیؔ — دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم

فانیؔ کی ایک غزل ملاحظہ کیجیے ؎

تیرا نگاہِ شوق کوئی رازداں نہ تھا — آنکھوں کو ورنہ جلوۂ جاناں کہاں نہ تھا
عالم جز اعتبارِ عیاں و نہاں نہ تھا — یعنی کہ تو عیاں نہ ہوا اور نہاں نہ تھا
مفہومِ کائنات تمہارے سوا نہیں — تم چھپ گئے نظر سے تو سارا جہاں نہ تھا
ہو بھی چکے تھے دامِ محبت میں ہم اسیر — عالم ابھی بقیدِ زمان و مکاں نہ تھا
آغوشِ موت میں تہِ دامانِ یار ہوں — وہ دن گئے کہ تجھ پہ کوئی مہرباں نہ تھا

فانیؔ فسونِ موت کی تاثیر دیکھنا
ٹھہرا وہ دل کہ جس پہ سکوں کا گماں نہ تھا

اصغر گونڈوی

اصغر حسین اصغر گونڈوی ۱۸۸۴ء میں گورکھپور کے محلہ الٰہی باغ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد تفضل حسین صدیقی تھے جو قانون گو کے منصب پر گونڈہ میں فائز تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ اصغر گونڈوی کی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول گونڈہ میں ہوئی اصغر اپنی تعلیم مکمل نہ کرسکے۔ اصغر گونڈوی نے ۱۹۱۳ء میں حضرت قاضی عبدالغنی منگلوری کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور پیر و مرشد نے تعلیم روحانی سے فیضیاب کیا۔[1]

اصغر گونڈوی ایک بلیغ اور قادر الکلام شاعر تھے لیکن مشاعروں میں کم جایا کرتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ جیسا کہ عبدالسلام سندیلوی نے اپنی کتاب "تصوف اور اصغر گونڈوی" میں لکھا ہے کہ:

> "الغرض اصغر گونڈوی مشاعروں میں بہت کم شرکت کرتے تھے اور اگر کبھی شرکت کرتے تھے تو معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ اصغر کا خیال تھا کہ مشاعروں میں سطحی اور عمومی اشعار پسند کئے جاتے ہیں کیوں کہ عوام زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہوتے ہیں اور اصغر کا کلام بہت اعلیٰ و ارفع ہوتا ہے جو عوام کی سطح سے بلند ہوتا تھا۔"[2]

اس کے باوجود ۱۹۱۷ء میں فیض آباد میں، ۱۹۲۰ء میں بلرام پور میں، ۱۹۲۴ء میں علی گڑھ اور گورکھپور کے مشاعروں میں شرکت کی ہے۔

اصغر گونڈوی کے کلام کے متعدد مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ آپ کا پہلا مجموعہ

---

[1] حضرت قاضی عبدالغنی منگلوری اپنے والد قاضی سید محمد اسمٰعیل کے مرید و جانشین تھے اور وہ حاجی امداداللہ مہاجر مکی کے مرید و خلیفہ تھے [2] تصوف اور اصغر گونڈوی مصنفہ ڈاکٹر اسلام سندیلوی ص ۳۸ ناشر نسیم بکڈپو دسمبر ۱۹۷۸ء

کلام "نشاطِ روح" دسمبر ۱۹۲۵ء میں مطبع معارف اعظم گڈھ سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ دوسرا مجموعۂ کلام "سرودِ زندگی" ۱۹۳۵ء میں انڈین پریس لمیٹیڈ سے شائع ہوا۔

تصوف میں صوفیوں کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ پہلے قسم کے صوفی وہ ہیں جو روحانی تجربات حاصل کرتے ہیں اور صوفی باعمل ہیں۔ دوسرے قسم کے صوفی وہ ہیں جو تصوف کی فلسفیانہ تشریحات میں ماہر ہیں۔ اصغر گونڈوی صوفی باعمل تھے وہ مرید بھی تھے اور تصوف کی راہ میں انہوں نے بذاتِ خود نئے کیں خلوص و عبادت اور صفائی قلب میں وہ اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ اصغر گونڈوی کے دو استاد تھے۔ پہلے انہوں نے منشی خلیل احمد وجد بلگرامی سے اصلاح لی اس کے بعد اپنی غزلیں منشی امیر اللہ تسلیم کو دکھائیں۔ اصغر گونڈوی کی شاعری کا نمایاں عنصر تصوف ہے مگر ان کا اندازِ بیان شاعرانہ ہے۔ اسی لئے اصغر کو صوفی شاعر کہنے میں نقادوں کے یہاں اختلافِ رائے ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اصغر نے حافظ شیرازی کی طرح اپنے تصوف کے اظہار کے لئے بادہ و ساغر کا سہارا لیا ہے۔ مثلاً ؎

مجھ پہ نگاہ ڈال دی اس نے تو اہلِ دین | صاف ڈبو دیا مجھے مَے طہور میں
اس نے مجھے دکھا دیا ساغرِ مَے اچھال کر | آج بھی کچھ کمی نہیں چشمک برق طور میں
ساقی تری نگاہ کو پہچانتا ہوں میں | مجھ سے فریبِ ساغر و مینا نہ چاہیئے

اس سلسلے میں عبدالسلام سندیلوی نے "تصوف اور اصغر گونڈوی" میں تحریر کیا ہے:۔

"غرض کہ حافظ کی شاعری میں جس قسم کے صوفیانہ رموز و نکات موجود ہیں وہ اصغر کے کلام میں بھی ملتے ہیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اصغر کی شاعری تصوف کی شاعری ہے ایسی صورت میں مجنوں صاحب کا یہ قول کہ اصغر کی شاعری میں حافظ کی مستی، خیام کی حکیمی حکمت، یا رومی کی عرفانیت نہیں ہے سراسر غلط ہے لہٰذا ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اصغر نے فارسی شعراء کی کورانہ تقلید نہیں کی ہے بلکہ ان کی جدت پسند طبیعت نے تصوف کیلئے اپنی نئی راہ تلاش کی ہے مگر بہر حال یہ نئی راہ تصوف ہی کی طرف جاتی ہے۔"[1]

---

[1] تصوف اور اصغر گونڈوی مصنفہ عبدالسلام سندیلوی۔ ص ۶۵-۶۴۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بھی اصغر کی شاعری میں تصوف کی چاشنی دیکھی ہے۔ وہ اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں کہ:-

"اصغر کی غزل حسرت سے بالکل مختلف ہے۔ حسرت تو مجازی عشق اور اس کی انسانی کیفیات کے شاعر ہیں۔ اصغر کی غزلوں میں مجازی کیفیات عشق کی ترجمانی نام کو بھی نہیں ہے وہ تو عشق حقیقی کے شاعر ہیں۔ اصغر تصوف کے شاعر ہیں اور تصوف کے مسائل کو پیش کرتے ہوئے وہ زندگی کی فضاؤں میں اتنے اونچے اڑتے ہیں کہ اپنے آپ کو کہیں کہیں نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔" [1]

علامہ نیاز فتحپوری کا خیال بھی اصغر گونڈوی کے سلسلے میں قابلِ توجہ ہے وہ اصغر گونڈوی کو حال و قال کا صوفی سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ:-

"اصغر صاحب اخلاق کے لحاظ سے باوجود لقشف مذہبی نہایت نیک نفس انسان ہیں اور اپنے اعمال و اوراد کے لحاظ سے اچھے خاصے مرد تور ہے۔ اس لئے اصولاً انہیں شاعری سے کوئی لگاؤ نہ ہونا چاہئے لیکن خوش قسمتی سے وہ صاحب حال و قال صوفی بھی ہیں اور ظاہر ہے کہ جب ایک صوفی حال سے گزر کر قال میں آتا ہے تو وہ اکثر شعر ہی کہتا ہے۔" [2]

اصغر گونڈوی چونکہ سلسلہ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے اور اس سلسلے کا خاص مسلک وحدت الوجود ہے اس لئے اصغر وحدت الوجود کو اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

جو نقش ہے ہستی کا دھوکہ نظر آتا ہے ۔۔۔ پردے پہ مصوّر ہی تنہا نظر آتا ہے
لو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے ۔۔۔ فانوس کی لغزش سے کیا کیا نظر آتا ہے

خدا کی ذات تو ایک ہی ہے لیکن اس کی جلوہ نمائی ہر جگہ ہے اس کو اصغر اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو ۔۔۔ نظر بھی چاہئے کچھ حسنِ رہگزر کے لئے

---

[1] غزل اور مطالعہ غزل مصنفہ ڈاکٹر عبادت بریلوی صفحہ ۳۹۹-۴۰۰ بحوالہ تصوف اور اصغر گونڈوی صفحہ ۱۵ [2] انتقادیات حصہ اول مصنفہ نیاز فتحپوری صفحہ ۱۹۹ مطبوعہ عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد دکن بحوالہ تصوف اور اصغر گونڈوی۔

اصغر کا خیال ہے کہ کائنات میں صرف حسن حقیقی کا نیرنگ جلوہ فرما ہے۔ حسن حقیقی کے علاوہ اس دنیا میں کسی کا اصل وجود نہیں ہے کبھی وہ شمع کی صورت میں اور کبھی پروانہ کی صورت میں ؎

کارفرما ہے فقط حسن کا نیرنگِ خیال ۔ چاہے وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے

اس شعر کو ملاحظہ کیجئے ؎

جہاں کبھی میری نگاہوں سے ہو چلا معدوم ۔ ارے بڑا غضب! اے چشم سحر کار ہوا

حسن تو فقط ذاتِ باری کا ہے مگر اس حسن کے جلوے ہزاروں رنگ میں کائنات میں بکھرے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

حسن ہزار طرز کا اک جہاں اسیر ہے ۔ ملحد باخبر بھی گم ہے جلوۂ لاالہٰ میں

وحدت الوجود کو ایک حسین مثال کے ذریعہ واضح طور پر پیش کیا ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

حسن بنکر خود کو عالم آشکارا کیجئے ۔ پھر مجھے پردہ بنا کر مجھ سے پردہ کیجئے

وحدت الشہود کا مسئلہ بھی تصوف کا ایک اہم مسئلہ ہے اس میں صوفی بظاہر کائنات میں خدا کے جلوے کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اصغر کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

پھر یہ سب یورش و ہنگامۂ عالم کیا ہے ۔ اسی پردہ میں اگر حسن جنوں ساز نہیں

خیرہ کئے ہے چشم حقیقت شناس بھی ۔ ہر ذرّہ ایک مہرِ منوّر لئے ہوئے

کس طرح حسن دوست ہے بے پردہ آشکار ۔ صدہا حجابِ صورت و معنیٰ لئے ہوئے

حقیقت کا شعر اصغر کے یہاں اس طرح پر ہے ملاحظہ ہو ؎

اسرارِ عشق ہے دلِ مضطر لئے ہوئے ۔ قطرہ ہے بے قرار سمندر لئے ہوئے

فنا بقا تصوف کا ایک خاص نقطۂ خیال ہے۔ اس وادی میں پہنچ کر صوفی اپنی ہستی کو فنا کر دیتا ہے اور ذاتِ حق میں گم ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

اب مجھے بھی خود نہیں ہوتا ہے کوئی امتیاز ۔ مٹ گیا اس طرح اس نقشِ پا کے سامنے

اصغر کی ایک غزل پیشِ خدمت ہے جس میں ان کے صوفیانہ خیالات کی جلوہ گری ہر شعر میں ہے ؎

ترکِ مدعا کردے عین مدعا ہو جا — شانِ عبد پیدا کر مظہرِ خدا ہو جا

اس کی راہ میں مٹ کر بے نیازِ خلقت بن — حسن پر فدا ہو کر حسن کی ادا ہو جا

برگِ گل کے دامن پر رنگ بن کے چھنا کیا — اس فضائے گلشن میں موجۂ صبا ہو جا

تو ہے جب پیام اس کا پھر پیام کیا تیرا — تو ہے جب صدا اس کی آپ بے صدا ہو جا

آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو — پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا

سازِ دل کے پردوں کو خود وہ چھیڑتا ہے جب — جانِ مضطرب بن کر تو بھی لب کشا ہو جا

قطرۂ تنک مایہ بحرِ بیکراں ہے تو
اپنی ابتدا ہو کر اپنی انتہا ہو جا[1]

---

[1] مسائل تصوف ص ۱۸۰، میکش اکبرآبادی

کتابیات

اردو نثر پارے :۔ ڈاکٹر محی الدین قادری

اردو نثر کا آغاز و ارتقا :۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ

اردوئے قدیم :۔ شمس اللہ قادری

الشرف :۔ ڈاکٹر محمد طیب ابدالی

انتخاب سراج اورنگ آبادی : مکتبہ جامعہ

انتقادیات (حصہ اول) :۔ علامہ نیاز فتحپوری

انوار ولایت :۔ حضرت عبدالقادر اسلام پوری

تاریخ مشائخ چشت :۔ خلیق احمد نظامی

تحقیقی مقالہ (مخطوطہ برائے پی ایچ ڈی) :۔ ڈاکٹر کلیم احمد عاجز

تذکرہ ابو نجیب سہروردیؒ :۔ مولانا حسن میاں پھلواروی

تذکرۃ الابرار :۔ شاہ محمد واجد

تذکرہ ریاض الفصحا :۔ مصحفی

تذکرہ شورش :۔ مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی

تذکرہ قطب العالمین :۔ مصنفہ محمد ضیاء الدین

تذکرہ مسلم شعرائے بہار :۔ مولانا سید احمد اللہ ندوی

تذکرہ مشاہیر کوری :۔ محمد علی جنید کاکوروی

تصوف اسلام :۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی

تصوف اور اصغر گونڈوی :۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی

بادۂ عرفان (حصہ اول) ڈاکٹر محمد طیب ابدالی

حدائق بخشش (حصہ اول) احمد رضا خان فاضل بریلویؒ

حدیث منیر :۔ مرتبہ مقبول احمد لاری

خزینۃ الاصفیا :۔ غلام سرور لاہوری

خواجہ میر درد تصوف اور شاعری :۔ ڈاکٹر وحید اختر

دیوان حضرت کمال (مخطوطہ) شاہ کمال علی دیورویؒ

دیوان فانی گورکھپوری :۔ مرتبہ شاہ مصطفیٰ علی سبز پوش گورکھپوریؒ

ذریعہ دولت :۔ حضرت صوفی منیریؒ

سند اجازت و خلافت (مخطوطہ) حضرت عبدالحق مہاجر مکیؒ

سیر الاولیا :۔ جامع حضرت سید مبارک المعروف امیر خوردؒ

صوفی منیری کے نثری کارنامے :۔ ڈاکٹر محمد طیب ابدالی

ضیاء القلوب (ملفوظ) حضرت سید احمد چرم پوش سہروردیؒ

عوارف المعارف :۔ حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ

عین المعارف (دیوان آسی) حضرت شاہ شاہد علی فانی گورکھپوریؒ

غرۃ الکمال (دیوان) حضرت امیر خسرو دہلویؒ

غزل سرا :۔ مجنوں گورکھپوری

غزل اور مطالعہ غزل :۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی

خاقانی کی شاعری :- ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

فوائد رکنی :- حضرت مخدوم جہاں شیخ
شرف الدین یحییٰ منیریؒ

caudri order in Bengal
By D. S. S. M. A. Kharasani

قدیم اردو :- مرتبہ مولانا عبد الحق

کشف المحجوب :- شیخ علی داتا گنج بخش ہجویریؒ

کلیاتِ ولی :- مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

کنز الانساب :- مولوی کبیر الدین

گلِ رعنا :- حکیم عبد الحی

گلشنِ بے خار :- مصطفےٰ خاں شیفتہ

لکھنؤ کا دبستان شاعری :- ابو اللیث صدیقی

لمعات :- مصنفہ شیخ ابو نصر سراج

مثنوی سر عطا (مخطوطہ) شاہ عطا حسین خاں گیاویؒ

مذہب و شاعری :- ڈاکٹر اعجاز حسین

مرزا اور ان کا اردو کلام :- عبد الرزاق قریشی

مرزا محمد علی ندوی۔ عصر، حیات و شاعری :-
ڈاکٹر سید محمد حسنین

مسائل تصوف :- میکش اکبرآبادی

مطالعہ ولی :- ڈاکٹر شارب ردولوی

معدن المعانی (ملفوظ) حضرت مخدوم جہاںؒ

معراج العاشقین :- مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم

مکتوبات صدی :- حضرت مخدوم جہاںؒ

مونس القلوب (مخطوطہ) ملفوظ حضرت
مخدوم احمد لنگر دریا بلخیؒ

نذرِ محبوب :- شاہ محمد اکبر داناپوریؒ

نسب نامہ فیض الرمل (مخطوطہ) :- حضرت
فیض علی دیوروی؟

نکات شعر :- مولوی قدرت اللہ صدیقی

نقوش صبیح :- مرتبہ متین عمادی

یادگارِ عشق :- ثاقب عظیم آبادی

مصنف کی دوسری کتابیں

۱- الشرف (حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا تذکرہ)	۴۰ روپے
۲- حضرت صوفی منیریؒ کے نثری کارنامے	۵۰ //
۳- راحتِ روح (اردو کی رمزی و تمثیلی داستان)	۳۰ //
۴- وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت (بزرگانِ دین کا تذکرہ)	۴۰ //
۵- جادۂ عرفاں (حصہ اول) (تصوف اور سلاسل کا تذکرہ)	۴۰ //
۶- تذکرہ مشائخ بہار	زیر طبع
۷- جادۂ عرفاں (حصہ دوم)	//
۸- حضرت آسی غازی پوریؒ	//

ملنے کے پتے

۱- ڈاکٹر طیب ابدالی	دار الشرف - باری روڈ - گیا
۲- مکتبہ صوفیا	خانقاہ اسلام پور - ڈاکخانہ اسلام پور - ضلع نالندہ
۳- بک امپوریم	سبزی باغ - پٹنہ - ۴
۴- اسٹار بکڈپو	۴- اچاریہ جگدیش بوس روڈ - پارک اسٹریٹ کلکتہ ۱۷

MYSTICS POETRY

IN

URDU

BY

Dr. Mohd. Taiyeb Abdali

Deptt. of Urdu & Persian

Magadh University

Bodh Gaya

Mystics Poetry in Urdu
By Dr. Mohd. Taiyeb Abdali

Rs. 36

مصنف کی دوسری مطبوعہ تصانیف

۱۔ حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے

۲۔ الشرف

۳۔ راحتِ روح

۴۔ وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت

۵۔ جادۂ عرفاں (حصۂ اول)

۶۔ انتخاب کلام آسی غازی پوری

زیر ترتیب

۱۔ تذکرۂ مشائخ بہار

۲۔ جادۂ عرفاں (حصہ دوم)

۳۔ حضرت آسی غازیپوری "حیات اور شاعری"

Jacket Printed at Angle Printers, Allahabad.